مغرب اور عالم اسلام کی فکری و تہذیبی کشمکش

اور

مسلم اہل دانش کی ذمہ داری

مولانا محمد عیسیٰ منصوری

ناشر

ورلڈ اسلامک فورم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پردستیاب تمام الیکٹرانک کتب...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

مغرب اور عالم اسلام کی فکری و تہذیبی کشمکش

اور

مسلم اہل دانش کی ذمہ داری

مولانا محمد عیسیٰ منصوری

ناشر
ورلڈ اسلامک فورم

نام کتاب -------- مغرب اور عالم اسلام کی فکری و تہذیبی کش مکش

مولف -------- مولانا محمد عیسیٰ منصوری

ناشر -------- ورلڈ اسلامک فورم لندن

صفحات -------- ٩٦

قیمت

طبع اول -------- ۲۰۰۰

ملنے کے پتے
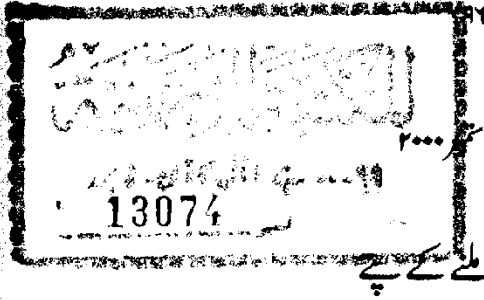
71 DELAFIELD HOUSE,

CHRISTIAN ST., LONDON E1 1QD (U.K.)

الشریعہ اکادمی، پوسٹ بکس ۳۳۱ گوجرانوالہ

مدینہ کتاب گھر، اردو بازار، گوجرانوالہ

مکتبہ نعمانیہ، اردو بازار، گوجرانوالہ

مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

مکہ کتاب گھر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور

فہرست

پیش لفظ

از مولانا زاہد الراشدی

مولانا محمد عیسیٰ منصوری ہمارے دور کے ان صاحب فکر و نظر علماء میں سے ہیں جو اسلامی تعلیمات واحکام کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور مغربی اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی علمی' فکری اور تہذیبی کشمکش پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور پورے درد دل کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف طبقات اور ارباب فہم ودانش کو اس حوالہ سے ان کی ذمہ داریوں اور ملی ودینی تقاضوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔

مطالعہ و تحقیق اور تجزیہ وتنقیح ان کا خصوصی شغف ہے اور مختلف اخبارات وجرائد میں شائع ہونے والے ان کے تحقیقی و تجزیاتی مضامین ارباب فکر ونظر کی فکری ونظریاتی تشنگی کو کم کرنے کے لیے ٹھنڈے اور شیریں پانی کے رواں چشمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک عرصہ سے یہ آرزو تھی کہ مولانا منصوری کے مضامین ومقالات مختلف عنوانات کے تحت کتابی مجموعوں کی شکل میں سامنے آئیں تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں اور ان قیمتی مضامین کی حفاظت کی صورت بھی نکل آئے مگر وسائل کے فقدان اور زمانے کی قدر ناشناسی نے اس کی راہ مسلسل روکے رکھی مگر اب یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ کچھ دوستوں نے اس کار خیر میں تعاون کا ہاتھ بڑھایا ہے اور مولانا منصوری کے مضامین کے مختلف مجموعوں کے اشاعت پذیر ہونے کی صورت دکھائی دینے لگی ہے۔ ان میں سے ایک مجموعہ زیر نظر کتابچہ کی شکل میں آپ کے سامنے ہے جس میں مولانا موصوف نے مغرب

کے نظریات وافکار کے تاریخی ارتقاء اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مغرب کی فکری وتہذیبی کشمکش کے مختلف مراحل کا جائزہ لیا ہے اور ایک مجموعی تناظر کو معروضی انداز میں پیش کر کے مسلمان علماء اور اہل دانش کو ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے جو مغرب اور مسلمانوں کی تاریخی کشمکش کے پس منظر میں ان پر عائد ہوتی ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ مولانا موصوف کی یہ سعی بار آور ہو اور وہ مسلمانوں میں جس فکر وجذبہ کو عام کرنا چاہتے ہیں' یہ مجموعہ اس کے فروغ میں موثر ذریعہ ثابت ہو' آمین یا رب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے "لا" سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ "الا"

مغربی افکار و نظریات اور ان کا تاریخی پس منظر

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ علماء نے ہر دور میں پیدا ہونے والی گمراہیوں کا تعاقب کیا۔ ان کا گہرا مطالعہ و تجزیہ کر کے علمی و عقلی طور پر ان کی کمزوری و کجی واضح کی۔ اس طرح ان گمراہیوں کا تار و پور بکھیر کر ختم کر دیا مگر عصری گمراہیاں جو مغرب سے برآمد شدہ جدید نظریات کی دین ہیں' ان کی نوعیت کچھ الگ سی ہے۔ وہ عموماً" اسلامی اصطلاحات و تصورات ہی کو غلط معنی و مفہوم میں پیش کرتے ہیں اور جدید سائنٹفک اسلوب اور بھاری بھرکم اصطلاحات کی بدولت لوگوں کو مرعوب کر دیتے ہیں۔ ادھر مسلمان صدیوں سے دور زوال میں ہیں جو گزشتہ صدی میں اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور یہ زوال صرف سیاسی نہیں' علمی و فکری' تمدنی و معاشرتی بھی ہے اس لیے علماء کرام ان جدید افکار و نظریات پر کماحقہ توجہ نہیں دے سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک علماء یورپ کی ذہنی و فکری تاریخ' مذہب و سائنس کے مابین معرکہ آرائی کی طویل تاریخ اور اس کے نتیجہ میں یورپ میں مذہب کے انحطاط و زوال اور اہل مغرب کی ذہنی ساخت' ان کے طریقہ کار و طریقہ واردات سے پوری طرح واقف نہیں ہوں گے' وہ نئی نسل کو متاثر نہیں کر سکیں گے اور نہ ان کو جدیدیت یا نئی گمراہیوں سے بچانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ پہلے گمراہیوں کا دائرہ نہایت محدود ہوا کرتا تھا' رقبہ کے اعتبار سے بھی اور خود گمراہیوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی۔ علماء جیسے ہی ان گمراہیوں کی نوعیت و حقیقت کو واضح کرتے' یہ گمراہیاں یا تو بالکل غائب ہو جاتی تھیں یا ان کا زور ٹوٹ جاتا تھا جبکہ جدید گمراہیوں کا دائرہ عالمگیر ہے۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ پہلے گمراہیاں عموماً" خود مسلمانوں کے اندر سے پیدا ہوتی تھیں جبکہ نئی گمراہیاں مغرب سے امپورٹ ہو کر

پہنچ رہی ہیں اور ان کی پشت پر آج کے ترقی یافتہ مغرب کی سیاسی واقتصادی وعسکری قوت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ انسان کے نفس وخواہش کو تسکین دینے والے عوامل ومضمرات بھی رکھتی ہیں۔ مغرب کی نفسیات اور اس کی ذہنی و فکری تاریخ کو سمجھے بغیر نہ تو جدید طبقہ کے اعتراضات وسوالات کا تشفی بخش جواب دیا جا سکتا ہے اور نہ عصر حاضر کی ذہنی سطح کے مطابق اسلام کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں ان موضوعات پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے' علماء کرام عموماً" ان سے ناواقف ہیں مثلاً" فرانس کے مشہور مفکر رینے گنوں جن کا اسلامی نام عبدالواحد ہے (المتوفی ۱۹۵۲ء) ان کے بارے میں جامعہ ازہر کے صدر شعبہ دینیات ڈاکٹر محمود نے ایک کتاب الفیلسوف المسلم رینیے گینوں او عبد الواحد یحیی تحریر کی۔ جناب رینے گیوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے اس موضوع پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اکیلی ہستی نے ایک ادارہ یا اکاڈیمی کا کام کیا ہے۔ ان کی پچیس سے زیادہ کتابیں فرنچ (فرانسیسی) میں ہیں۔ وہ اس پائے کے عالم اور مفکر مانے جاتے ہیں کہ مغرب نے گزشتہ چھ سو سال میں اتنا بڑا مفکر وفلفی پیدا نہیں کیا۔ علمی حلقوں کی طرف سے پاکستان کے معروف دانشور جناب حسن عسکری مرحوم بجا طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے رینے گیوں (شیخ عبدالواحد یحییٰ) کی کتابوں سے اہم مباحث کا خلاصہ اپنے مجموعہ میں نہایت سلیس اور آسان زبان میں پیش کر دیا ہے۔ زیر نظر مقالہ کا بڑا حصہ اسی سے مستفاد ہے۔ رینے گیوں کا موقف یہ ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب کی اساس ملحدانہ اور ابلیسی ہے۔ یہ مغربی تہذیب یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تخلیق ہے اور مغرب کی نشاۃ ثانیہ مذہب سے بغاوت کا دوسرا نام ہے۔

موجودہ دور میں مذہب بیزاری و الحاد پرستی کی جڑ فلسفہ مادیت ہے جو انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب اور بیسویں صدی کے سائنسی انقلاب کی وجہ سے عام ہوا اور اس نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان میں بعض فلسفے بظاہر مذہبی یا مذہب سے قریب نظر آتے ہیں لیکن تحقیق کرنے پر ان کی بنیاد بھی مادیت ہی نکلتی

کے سیاسی و سائنسی عروج کی وجہ سے ترقی پسندی و جدیدیت کے نام سے ان تمام گمراہ کن افکار و نظریات نے عالم اسلام پر یک بارگی حملہ کر دیا ہے اور یہ حملہ علم و تحقیق' ترقی وجدیدیت اور خوشنما اصطلاحات کے جلو میں ایک ایسی سمت سے ہو رہا ہے کہ ایک عام مسلمان کا ذہن اسلام سے عقیدت کے باوجود اس ریلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ ایک گمراہی سے نجات پاتا ہے تو دوسری گمراہی آگھیرتی ہے۔ عالم اسلام میں گزشتہ سو سال کے عرصہ میں مسلسل عام لوگوں خصوصا" جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن آہستہ آہستہ مسخ ہوا ہے۔ اگرچہ اسلام کو ہر دور میں مختلف گمراہیوں سے سابقہ رہا لیکن پہلے زمانہ میں گمراہ کرنے والے لوگ اسلامی اصطلاحات واسلامی تصورات ہی کو غلط طریقے سے استعمال کرتے تھے اس لیے انہیں دور کرنا آسان تھا مگر مغرب سے امپورٹ کردہ نئی گمراہیاں ایک نئی زبان اور نئی اصطلاحات کے جلو میں سامنے آئی ہیں۔ مہمل سے مہمل نظریہ بھاری بھرکم علمی اصطلاحات کے پردے میں اس طرح چھپ جاتا ہے کہ آدمی خواہ مخواہ مرعوب ہو جاتا ہے اور چونکہ علماء کو اس نئی زبان اور نئی اصطلاحات کی نوعیت سے اور ان کے تاریخی پس منظر سے پوری آگہی نہیں ہوتی' اس لیے ان کے جوابات ہماری نئی نسل کو مطمئن نہیں کر پاتے۔ یورپ میں گمراہی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جدید مفکرین خالص مذہبی اصطلاحات ہی کو نئے معنی میں استعمال کرتے ہیں پھر یہ لوگ ان اصطلاحات کے معنی کو تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد بدلتے رہتے ہیں پہلے یہ معنی بیس پچیس سال کی بعد بدلتے تھے تو اب ہر چار پانچ سال میں تبدیل ہو جاتے ہیں بلکہ اب تو مغرب میں یہ حال ہے کہ ایک ہی زمانہ میں دس لکھنے والے ایک ہی لفظ کو دس مختلف معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بین مثال لفظ فطرت ہے بلکہ خود لفظ مذہب اتنے معنی میں استعمال ہوتا ہوا ہے کہ اس کے کوئی معنی باقی نہیں رہے۔ پھر یہ لوگ بھاری بھرکم اصطلاحات کو اس چابک دستی سے اور اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا کوئی مطلب اخذ نہیں کر سکتا اور اس کا ذہن معطل ہوجاتا ہے اور یہی ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ خوشنما اصطلاحات براہ

کے سیاسی و سائنسی عروج کی وجہ سے ترقی پسندی و جدیدیت کے نام سے ان تمام گمراہ کن افکار و نظریات نے عالم اسلام پر یک بارگی حملہ کر دیا ہے اور یہ حملہ علم و تحقیق' ترقی وجدیدیت اور خوشنما اصطلاحات کے جلو میں ایک ایسی سمت سے ہو رہا ہے کہ ایک عام مسلمان کا ذہن اسلام سے عقیدت کے باوجود اس ریلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ ایک گمراہی سے نجات پاتا ہے تو دوسری گمراہی آگھیرتی ہے۔ عالم اسلام میں گزشتہ سو سال کے عرصہ میں مسلسل عام لوگوں خصوصاً" جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن آہستہ آہستہ مسخ ہوا ہے۔ اگرچہ اسلام کو ہر دور میں مختلف گمراہیوں سے سابقہ رہا لیکن پہلے زمانہ میں گمراہ کرنے والے لوگ اسلامی اصطلاحات واسلامی تصورات ہی کو غلط طریقے سے استعمال کرتے تھے اس لیے انہیں دور کرنا آسان تھا مگر مغرب سے امپورٹ کردہ نئی گمراہیاں ایک نئی زبان اور نئی اصطلاحات کے جلو میں سامنے آئی ہیں۔ مہمل سے مہمل نظریہ بھاری بھرکم علمی اصطلاحات کے پردے میں اس طرح چھپ جاتا ہے کہ آدمی خواہ مخواہ مرعوب ہو جاتا ہے اور چونکہ علماء کو اس نئی زبان اور نئی اصطلاحات کی نوعیت سے اور ان کے تاریخی پس منظر سے پوری آگہی نہیں ہوتی' اس لیے ان کے جوابات ہماری نئی نسل کو مطمئن نہیں کر پاتے۔ یورپ میں گمراہی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جدید مفکرین خالص مذہبی اصطلاحات ہی کو نئے معنی میں استعمال کرتے ہیں پھر یہ لوگ ان اصطلاحات کے معنی کو تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد بدلتے رہتے ہیں پہلے یہ معنی بیس پچیس سال کی بعد بدلتے تھے تو اب ہر چار پانچ سال میں تبدیل ہو جاتے ہیں بلکہ اب تو مغرب میں یہ حال ہے کہ ایک ہی زمانہ میں دس لکھنے والے ایک ہی لفظ کو دس مختلف معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بین مثال لفظ فطرت ہے بلکہ خود لفظ مذہب اتنے معنی میں استعمال ہوتا ہوا ہے کہ اس کے کوئی معنی باقی نہیں رہے۔ پھر یہ لوگ بھاری بھرکم اصطلاحات کو اس چابک دستی سے اور اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا کوئی مطلب اخذ نہیں کر سکتا اور اس کا ذہن معطل ہو جاتا ہے اور یہی ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ خوشنما اصطلاحات براہ

راست جذبات کو متاثر کرتی ہیں۔ پڑھنے والا اپنے ذہن سے کام لینے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ جب تک علماء کرام موجودہ مغربی ذہن کو تشکیل دینے والے عوامل' ان کے پس منظر اور طریقہ واردات سے پوری طرح آگاہی حاصل نہیں کرتے' ان کی تقریر و تحریر نئی نسل کے لیے ناقابل فہم ہی رہے گی اور وہ ان کے شبہات کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ بغور جائزہ لیا جائے تو اصل لڑائی آسمانی وحی اور مادہ پرستوں کے عقلی افکار کے درمیان ہے جن کی پشت پر نفس اور خواہشات کارفرما ہیں۔ انسانی معاشرہ کی رہنمائی کے لیے قابل اعتماد اور محفوظ ذریعہ ہر دور میں فقط وحی الٰہی رہا ہے جو حضرات انبیاءؑ کی اساس اور ان کا طرز رہا ہے نہ کہ عقل محض۔ انسانی تاریخ کا جائزہ بتاتا ہے کہ عقل ایک ایسا کمزور اور بے بس رہنما ہے جو اکثر خود کو نفس و خواہشات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ انسانی معاشرہ کے فساد وبگاڑ اور تباہی کی اصل وجہ نفس و خواہشات کی پیروی رہی ہے۔ اگر وحی کی رہنمائی نہ ہو تو اکثر عقل جذبات کے زیر اثر کام کرنے لگتی ہے۔ یاد رہے عقل جج نہیں' وکیل ہے جیسا مقدمہ اسے دیا جائے گا اسی کے مطابق وہ وکالت کرے گی۔ یہ ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جو دونوں طرف چلتی ہے اس سے جس طرح دینی حقائق کو ثابت کیا جاسکتا ہے' اسی طرح باطل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ وکیل کی وکالت و ذہانت پر موقوف ہے کہ وہ مقدمہ کے کس پہلو کی تائید یا تردید کرنا چاہتا ہے۔ عقل نے ہمیشہ جذبات و خواہشات کے حق میں دلائل تراشے ہیں اس طرح جذباتی رویہ کو عقلی رویہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ وہ اپنے جذباتی رویہ سے لپٹا رہنا چاہتا ہے۔ تاریخ کا طویل تجزیہ بتاتا ہے کہ وحی کی رہنمائی کو ٹھکرانے کے بعد انسان کا رہنما اس کے جذبات و خواہشات ہوتے ہیں نہ کہ اس کی عقل۔ اگرچہ ہمیشہ علمی و منطقی طور پر عقل ہی کو بلند مقام دیا گیا ہے مگر عملاً یہی ہوا کہ عقل جذبات و خواہشات کی آلہ کار بنتی رہی ہے۔ انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ عقل جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہو پائی ہو۔

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ یورپ کی معلوم تاریخ وحی و رسالت کے مفہوم سے ناآشنا ہے۔ جب ہم یورپین اقوام کی تاریخ وتمدن کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس خطہ ارض کی پوری تمدنی ومعاشرتی تاریخ میں وحی و رسالت سے بے خبری پائی جاتی ہے۔ انبیاءؑ تو درکنار یہاں (اہل اللہ) یا مردان حق کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اقوام یورپ حضرت آدم کے اس نافرمان بیٹے کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو حق کے انکار اور سرکشی وعناد پر کمربستہ رہا۔ آج دنیا کی بیشتر جدید عالمگیر گمراہیاں اسی لامذہب تمدن ومعاشرت کی لائی ہوئی ہیں۔ اب آیئے ہم مغرب کی فکری ونظریاتی تاریخ کا جائزہ لیں اور جدیدیت کے پس منظر کا تجزیہ کرکے ان اسباب و عوامل کا سراغ لگائیں جس نے آہستہ آہستہ موجودہ مغرب کے ذہن و فکر کو تیار کیا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے یورپ کی معلوم تاریخ کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ یونانی دور۔ یہ پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔

۲۔ رومن دور۔ یہ دوسری صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی تک ہے۔

۳۔ ازمنہ وسطی یعنی یورپ کا مذہبی دور۔ جو پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک ایک ہزار سال کو محیط ہے۔

۴۔ نشاۃ ثانیہ یا جدیدیت کا دور۔ اس کا آغاز ۱۴۵۳ء یعنی پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے مانا جاتا ہے یہ جدید دور کا نقطہ آغاز ہے جب علمی و فکری طور پر مذہب کو نفس و خواہشات کے تابع کرنے کی کوشش شروع ہوئیں۔

۵۔ عقلیت کا دور۔ سترھویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسویں تک ہے۔ یہ یورپ میں صنعتی وسائنسی انقلاب کا دور ہے۔

۶۔ عصر حاضر یا بیسویں صدی۔ یہ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۹ء سے مانا جاتا ہے۔ یہ افکار ونظریات کے ذریعہ نئے نئے الحادی مذہب پیدا کرنے کا دور ہے۔

اب آیئے ہم قدرے تفصیل سے ان ادوار کا جائزہ لیں۔

یونانی دور

یہ فلسفہ کے عروج کا دور ہے۔ اس کا زمانہ ۵۰۰ قبل مسیح سے دو سو سال قبل مسیح تک سمجھا جاتا ہے۔ اسے یونان کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ فلسفہ کے معنی حکمت سے محبت رکھنا ہے۔ یہ سقراط' افلاطون اور ارسطو کا دور ہے۔ اس دور میں اشراقی تصورات کا عروج ہوا۔ اسے ناقص توحید یا متصوفانہ طرز پر رموز کا دور کہنا چاہیے۔ اب اس دور کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ ہمارے دینی مدارس میں فلسفہ و معقولات کے نام سے جو علوم پڑھائے جاتے ہیں' وہ اسی دور کی باقیات ہیں۔ کئی صدیوں کے انقطاع کے بعد عہد عباسی میں یونانی علوم وافکار کے جو دفینے مل سکے تھے' عربوں نے انہیں نئی زندگی دینے کی کوشش کی۔ یاد رہے کہ یونانی فلاسفہ و مفکرین کی دو گروہ یا طبقے تھے۔ ایک یونان کا' دوسرے اسکندریہ کا۔ یونانیوں نے مصر فتح کرنے کے بعد اپنی نوآبادی اسکندریہ میں بسائی تھی۔ اس گروہ کے سب سے مشہور نمائندے فلاطینوس اور فرفریوس ہیں۔ ان کے عروج کا دور پہلی سے تیسری صدی عیسوی ہے۔ عربوں نے زیادہ تر فلسفہ' منطق' طب' نجوم وغیرہ انہی سے حاصل کیے لیکن یورپ کی تہذیب و معاشرہ پر ہمیشہ اثر دوسرے طبقہ یعنی یونان کے فلاسفہ و مفکرین کا رہا ہے جس نے آہستہ آہستہ موجودہ مغربی ذہن کو پیدا کیا۔ مذہبی اعتبار سے یونانی فلاسفہ کی فکر کبھی توحید کے درجہ کمال تک نہیں پہنچ سکی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یونانی فکر وجود کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکی یا اسلامی تصوف کی اصطلاح میں یونانی فلاسفہ و مفکرین عالم حیرت سے اوپر نہیں اٹھ سکے۔ اس لحاظ سے یونانی فکر صحیح معنی میں مابعد الطبیعات نہیں ہے۔ یورپ میں جتنی گمراہیاں بعد میں پیدا ہوئی ہیں' اس کی جڑ یونانی فلسفے و افکار ہی رہے ہیں کیونکہ ان افکار کی حکمرانی ہمیشہ یورپ کے ذہنوں پر قائم رہی۔ ان تمام گمراہیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یونانی اشراقیوں اور فلاسفہ کی حد پرواز یا منتہا محض صفائے نفس تک ہے۔ وہ صفائے قلب تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ ظاہر بینی اور مادہ پرستی یا مشاہدے کو تجربہ کی آخری وفیصلہ کن دلیل سمجھنے کا رجحان ارسطو سے شروع ہوا جو موجودہ مغربی فکر کی اساس

ہے۔ یونانی فلسفیوں کی توجہ کا مرکز انسانی معاشرہ تھا نہ کہ مبدا و معاد (جو مذہب کا مقصود ہوتا ہے) یعنی آخرت کے بجائے دنیویت ان یونانی فلاسفہ میں پوری طرح جڑ پکڑ گئی تھی۔ یونانی فلسفی ہر مسئلہ کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی میں جب یورپ نے مذہب سے بغاوت کر کے دوبارہ یونانی افکار و فلسفوں پر زور دینا شروع کیا تو اس تحریک کا نام ہی انسانیت پرستی (Humanism) رکھا۔ مذہب سے دوری کے ساتھ ساتھ یہ مادہ پرستی کا ذہن بتدریج گہرا ہوتا گیا۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ساری توجہ انسان کو ایک صحت مند جانور بنانے پر مرکوز رہتی ہے۔ اب مغرب روح اور اس کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے یکسر بے خبر ہو چکا ہے بلکہ اس نے روح اور نفس کو اتنا گڈمڈ کر دیا ہے کہ گزشتہ سو سال سے نفس ہی کو روح سمجھا جارہا ہے۔ یونانی فکر کی سب سے بڑی خامی یہی مادہ پرستی یا ظاہر بینی ہے جس نے مغرب کے ذہن و فکر کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

رومن دور

یورپ پر دوسری صدی عیسوی سے پانچویں صدی عیسوی تک سلطنت روما کے استیلاء و غلبہ کا دور ہے۔ اس دور کے زبردست اثرات یورپ کے ذہن و فکر کا حصہ بن چکے ہیں۔ روم کے لوگوں کی توجہ دنیوی رکھ رکھاؤ' شان وشوکت اور انتظامی امور پر زیادہ تھی۔ یہ لوگ سلطنت قائم کرنے اور نظم ونسق ٹھیک کرنے کے ماہر تھے۔ ان کے ذہن و فکر کی ساری طاقت قانون سازی اور تنظیمی ادارے بنانے میں صرف ہوتی تھی۔ مغرب کے ذہن وفکر پر رومن اثر اتنا شدید ہے کہ جب عیسائیت یورپ میں پہنچی تو اسے بھی ایک منظم ادارے کی شکل اختیار کرنی پڑی۔ اس کے بغیر یورپ میں عیسائیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ مسیحیت کے عقائد بھی وقتاً" فوقتاً" ضرورت کے لحاظ سے قوانین کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ یورپین عیسائیت کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مزاج و خواہش کے مطابق مذہب کے نام پر عیسائیت کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر لیا۔ ان کا مقصد اخروی نجات

کے بجائے صرف یہ تھا کہ مذہب کے نام پر دنیوی معاشرت و تمدن کے نظم و نسق کو کنٹرول کیا جائے۔ رومیوں کی اس قانونی تنظیمی و انفرادی ذہنیت نے ازمنہ وسطیٰ میں عیسائیت کو استحکام ضرور بخشا لیکن یورپ میں عیسائیت کے زوال کا باعث بھی یہی ذہنیت ہوئی کہ وہ مذہبی و روحانی سے زیادہ ایک بااختیار انتظامی ادارہ بن گئی تھی جس کی وجہ سے دنیوی بادشاہوں اور کلیسا کے مذہبی عہدیداروں کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہوئی۔ بالآخر کلیسا کے خلاف عام بغاوت ہوئی جس کے نتیجہ میں مذہب کو اجتماعی شعبوں سے بے دخل ہونا پڑا پھر آہستہ آہستہ اپنے دور کے افکار کی تابعداری کرنی پڑی۔ آج مغرب میں مادیت پرستی و ظاہر پرستی کا جو عروج ہے' اس میں رومن دور کے شان و شوکت کے اداروں' عیاشانہ طرز حیات اور ذہنیت کا بڑا دخل ہے جسے یورپ کی اکثر قوموں نے اپنے لیے نمونہ بنایا۔ رومنوں کا اصل خدا وطن یا قوم تھی۔ فرد سے مطالبہ کیا جاتا کہ وہ ہر چیز قوم یا وطن کے لیے قربان کر دے۔ یہ بیج آگے چل کر مغرب میں قوم پرستی (نیشنلزم) اور معاشرہ پرستی کی شکل میں بار آور ہوا۔ غور کیا جائے تو مغرب کے موجودہ نیشنلزم اور ویسٹرن سولائزیشن کی بنیاد یہی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں رومن واحد قوم تھی جنھوں نے تن پروری و عیش کوشی کو ایک اصول کی حیثیت سے اپنایا۔ اسے فلسفہ لذت پرستی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر بے مقصد نفس کشی کا فلسفہ وجود میں آیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی اصل مصیبت اس کی خواہشات و دنیوی لذات ہیں۔ اگر انسان بے حس ہو جائے کہ نہ خوشی کے موقع پر خوش ہو نہ غمی کے موقع پر غمگین تو اسے مکمل کامیابی و سکون مل جاتا ہے۔ یہ نفس کشی برائے نفس ہے۔ کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر نہیں جو خود ایک گمراہی ہے۔ خود کو بے مقصد اذیت دینے میں انسانیت کی معراج سمجھنا اور اذیت و تکلیف کو بجائے خود گرانقدر سمجھنا یہ مغربی ذہنیت کا لازمی جز ہے جو دراصل بے پناہ عیش کوشی و شہوت رانی کا فطری ردعمل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفس پروری' لذت پرستی اور بے مقصد نفس کشی کے اصول رومن تہذیب نے یورپ کو دیے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یورپ کی

پوری معلوم تاریخ انہیں دو اصولوں کے گرد گھومتی ہے۔ یونانی دور سے آج تک مغرب کے سارے افکار و نظریات اور فلسفے انہی دو چیزوں کے درمیان گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ مغرب کے پاس یا تو سراسر مادیت و نفس پروری اور لذت کوشی ہے یا اس کے ردعمل کے طور پر بے مقصد نفس کشی۔

ازمنہ وسطیٰ (یورپ کا مذہبی دور اور اس کا ردعمل)

یہ دور پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یورپ میں عیسائیت کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔ ہمیں یورپ کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یورپ کی عیسائیت بڑی حد تک یونانی و رومن افکار وعقائد کا ملغوبہ ہے۔ قرآن نے جس عیسائیت کا ذکر کیا ہے اور اسے نسبتاً اسلام کے قریب بتایا ہے' اس کا مصداق مشرق کی وہ عیسائیت تھی جس میں حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کے بڑے حصے میں تحریف وتبدل کے باوجود کہیں کہیں صحیح تعلیمات کے آثار ونشانات باقی رہ گئے تھے۔ یورپ کی مسیحیت اس سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس کا حضرت مسیحؑ کی شریعت وتعلیمات سے برائے نام بھی تعلق نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد تقریباً تین سو سال تک عیسائیت انتہائی مظلومیت و کس مپرسی کی حالت میں رہی۔ آپ کے ماننے والے زیادہ تر پہاڑوں کی غاروں یا صومعوں (عبادت گاہوں) میں راہبانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں رومن امپائر کے شہنشاہ قسطنطین اعظم نے عیسائیت قبول کر لی جو ۳۰۶ء سے ۳۳۷ء تک عظیم رومن سلطنت کا شہنشاہ تھا۔ اس نے سلطنت کی طاقت واثرات کے زور پر پورے یورپ میں مسیحیت پھیلا دی۔ چونکہ سلطنت کی طاقت اور جاہ وجلال کی بدولت مسیحیت آناً" فاناً" یورپ کا مذہب بن گئی تھی لوگوں نے اپنے ذہن وفکر کی تبدیلی کے ذریعہ مسیحیت قبول نہیں کی تھی اس لیے ان کے ذہن وفکر کا سانچا وہی رہا جو یونانی افکار و رومن عقائد نے بنایا تھا۔ انہوں نے اپنے مروجہ افکار وعقائد کے سانچے میں مسیحیت کو ڈھال لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

یونانی افکار و نظریات اور رومن عقائد کو مسیحیت کا نام دے کر اختیار کر لیا گیا چنانچہ ڈولف ہارمک لکھتا ہے۔ "چوتھی صدی عیسوی تک انجیل یونانی فلسفہ کے رنگ میں رنگ چکی تھی"

غرض رومن شہنشاہ قسطنطین کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد مسیحی پادریوں نے جلد از جلد مسیحیت پھیلانے اور اسے رومنوں کے لیے قابل قبول بنانے کی خاطر عیسائیت کو مروجہ عقائد وافکار کے سانچہ میں ڈھال لیا۔ اس زمانہ میں زیوس (Zeus) یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا جسے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا سمجھتے تھے۔ اس کی نقل میں پادریوں نے حضرت مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔ اسی طرح جب مسیحیت یورپ میں پہنچی تو اس کا سابقہ ارسطو کے افکار سے پیش آیا جو یہاں مقبول تھے۔ چرچ نے ارسطو کے افکار کا مقابلہ کرنے کی بجائے خود اپنے مذہبی علم کلام کو ارسطو کے افکار و فلسفہ کے مطابق ڈھال لیا حتیٰ کہ ارسطو کے طبیعی نظریات کو انہوں نے کتاب مقدس کی تفسیر کے طور پر اس میں داخل کر لیا جیسے وہ آسمان سے اترے ہوں۔ مذہب میں جب کوئی چیز عرصہ تک جاری رہتی ہے تو وہ مقدس بن جاتی ہے چنانچہ یونانی ورومن افکار بھی جو ابتداء میں "مصلحتاً" اختیار کیے گئے تھے' وہ مقدس بن کر مسیحیت کا حقیقی حصہ سمجھے جانے لگے حتیٰ کہ یونانیوں کے بے اصل وخیالی علوم عیسائیت کے مقدس علوم سمجھے جانے لگے۔ بعد میں ان علوم وافکار کا ٹکراؤ سائنس سے ہوا اور جدید سائنسی تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ ارسطو کے افکار محض قیاسی وبے بنیاد تھے۔ ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تو چرچ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت چاہیے تھا کہ ان قیاسی وخیالی یونانی افکار کو مذہب سے خارج کر دیا جاتا مگر چرچ نے اپنی عاقبت نااندیشی سے ان غلط افکار و نظریات کو مذہب کا جز بنائے رکھا اور جدید سائنس و علوم سے مقابلہ شروع کر دیا۔ چرچ نے محسوس کیا کہ اگر سائنسی تحقیقات قبول کر لی گئیں تو مسیحیت کے عقائد کا نظام مشتبہ ومشکوک ہو جائے گا اس لیے چرچ نے جبروطاقت سے علم و سائنس کو دبانا چاہا اور احتساب کی عدالتیں قائم کر کے علمی وسائنسی

نظریات کی بنیاد پر لاکھوں انسانوں کو سخت ترین سزائیں دیں۔ تقریباً" تیس ہزار انسانوں کو زندہ جلایا گیا۔ اس چیز نے یورپ میں مذہب کے خلاف عوامی غصہ و عناد کو جنم دیا۔ یہ علم ومذہب کا تصادم تقریباً" دوسو سال جاری رہا۔ بالاخر مذہب کو سائنس سے شکست تسلیم کرنی پڑی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس طرح سمجھوتا ہوا کہ علم ومذہب کے دائرے الگ الگ کر دیے گئے۔ مذہب کو محض شخصی دائرے کی چیز قرار دے کر اسے کاروبار زندگی سے بے دخل کر دیا گیا۔ غور کیا جائے تو یہ تقسیم محض علم ومذہب کی علیحدگی نہیں تھی بلکہ زندگی اور مذہب کی علیحدگی تھی کیونکہ جو چیز علمی و سائنسی طور پر غلط ثابت ہو جائے' وہ کس طرح شخصی زندگی کا حقیقی عنصر بن سکتی ہے؟ مذہب کو فرد کے شخصی معاملہ کے طور پر باقی رہنے کے لیے بھی اس کا علم وعقل کے مطابق ہونا ضروری ہے اس طرح یورپ میں مذہب زندگی کا محض رسمی حصہ بن کے رہ گیا۔ الغرض ازمنہ وسطی جسے آج قرون مظلمہ یا تاریک دور کہا جاتا ہے' صرف یہی دور کسی حد تک مذہبی دور تھا۔ گزشتہ دو صدیوں کی مذہب دشمن تحریک نے اس دور کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ آج ازمنہ وسطی کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے' وہ لادینوں عقل پرستوں اور مذہب سے بغاوت کرنے والوں (پروٹسٹنٹوں) کی کھینچی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مذہب سے وحشت دلانے کے لیے اس دور کا نام ہی تاریک دور رکھ چھوڑا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس دور میں بادشاہوں اور چرچ کے پادریوں نے مل کر عوام کو ظلم کے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ پادری علم کے ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ عوام کو علم سے محروم کر دیا تھا۔ پوپ نے جس چیز کو سفید کہہ دیا' وہ سفید اور جس چیز کو سیاہ کہہ دیا' وہ سیاہ۔ عوام کو ذرا فکری آزادی حاصل نہ تھی (خاص طور پر مذہب کے بارے میں) علم کی پرچھائیں تک عوام پر نہ پڑنے پاتی تھیں۔ کلیسا سائنس کا خاص طور سے دشمن تھا۔ جب بھی کسی نے کوئی نیا خیال پیش کیا' اس کی گردن مار دی گئی اس لیے لوگ سوچتے ہوئے بھی ڈرتے تھے اور ذہنوں کو زنگ لگ گیا تھا۔ قرون وسطیٰ کی یہ تصویر جزوی طور پر ہی صحیح ہے۔ یہ

تصویر بڑی حد تک خیالی ویک طرفہ ہے۔ اس میں بڑی حد تک غلو سے کام لیا گیا ہے۔ ویسے تو یورپ کی تاریخ کا ہر دور ظلم واستبداد اور عوام پر ستم رانی کا دور ہے' خواہ وہ قرون وسطیٰ سے پہلے کا ہو یا بعد کا حتیٰ کہ بیسویں صدی کے روشن خیال علم وسائنس کے دور میں دونوں عظیم جنگوں اور روس میں کمیونسٹ انقلاب میں اندازاً" پانچ کروڑ لوگ کام آئے۔ زخمی و معذور ہونے والوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ درحقیقت لذت پرستی اور عیش کوشی کے ساتھ قساوت قلبی و بے رحمی یورپ کے مزاج و طبیعت کا حصہ ہے۔ اب اس دور (قرون وسطیٰ) کے متعلق جو جدید تحقیقات سامنے آئی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی رشتوں کا جو احترام اس دور میں تھا' وہ مغربی معاشرہ میں کبھی نہیں رہا۔ معاشی اعتبار سے بھی اس دور میں کاریگروں اور پیشہ ور لوگوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ اس دور کے معاشرتی نظام میں اتنا عدل تھا کہ بعض اشتراکی رہنما و جماعتیں معاشرہ کی تشکیل اس دور کے پنچایتی نظام کی بنیاد پر کرنا چاہتی ہیں۔ خود کمیونزم کا بانی کارل مارکس بھی اس کو تسلیم کرتا ہے۔ رہا پوپ کے بے پناہ اختیارات کا معاملہ تو جدید دستاویزات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پوپ اس دور میں عموماً" بادشاہوں کے مظالم سے روکتے تھے اور عوام اور عوام کے حقوق کی نگہداشت کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیسا کے بے پناہ اختیارات کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں مگر یہ اتنی زبردست اور بنیادی نہیں تھیں جتنی مذہب بیزار اور عقل پرست (پروٹسٹنٹ) مصنفین نے پیش کی ہیں۔ اس دور میں یورپ کی تہذیب نے جو لطافت وعلو حاصل کیا تھا' وہ اسے پھر کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس دور سے عناد کی ایک بڑی وجہ اسلام سے یورپ کی روایتی عصبیت بھی ہے کیونکہ ازمنہ وسطیٰ کے علوم وفنون اور ادب پر عربوں کا گہرا اثر وچھاپ ہے۔ اس دور میں طب' نجوم وفلسفہ میں یونانیوں کے بعد عرب مصنفوں کو سند مانا جاتا تھا۔ رازی' ابن سینا' غزالی' ابن رشد یورپ میں اسی طرح مشہور تھے جس طرح مسلمانوں میں۔ حتیٰ کہ عرب شاعری کا اثر آئرلینڈ تک چھا گیا تھا جو اسپین سے خاصے فاصلے پر ہے۔ غرض اس دور کی تصویر کو غلط

طور پیش کرنے کا ایک مقصد مذہب دشمنی کے ساتھ ساتھ یورپ پر عربوں کے کے علوم واثرات کا انکار بھی ہے۔ چونکہ اس دور میں یونانی فلسفہ کو بھی مذہب کی تابعداری قبول کرنی پڑی تھی اس لیے مذہب بیزار مصنفین عمداً" اس کا منفی رخ پیش کرتے ہیں۔ اس دور کا سب سے بڑا مفکر سینٹ ٹامس ایکوناس سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تیرھویں صدی میں عیسوی الہیات و دینیات کو ابن رشد کے فلسفہ سے ہٹا کر ارسطو کے فلسفہ کی بنیاد پر دوبارہ قائم کیا۔ آج چونکہ یورپ مذہب کے خلاف عناد کو اپنا چکا ہے اس لیے عمداً" اس دور کی غلط تصویر پیش کرکے ایک قسم کی ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں' عیسائیت یورپ میں رومن شہنشاہ کے اثرات کی وجہ سے پھیلی تھی اور پادریوں نے جلد از جلد مسیحیت کی اشاعت کی خاطر مصلحتاً" اس میں بہت سے رومن میتھالوجی (بت پرستی) عقائد ویونانی افکار سمو لیے تھے جو محض تخیلی مفروضے تھے' حقیقت واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ چیز بعد میں سائنسی ترقی کے دور میں عیسائیت کے لیے وبال اور اس کے خلاف عقل ہونے کا ثبوت بن گئی۔ اسی طرح پادریوں نے عیسائیت کو رومن سلطنت کے انتظامی شعبوں کے نمونہ پر اسے منظم کیا تھا جس کی وجہ سے چرچ حکومتوں کے متوازی ایک مذہبی سلطنت بن گیا۔ جہاں کہیں غیر معمولی اختیارات کا ارتکاز ہوتا ہے تو لازماً" کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح چرچ کے عہدیداروں میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اس پر پہلے تو اصلاحات کی بحث شروع ہوئی۔ دنیا میں ہمیشہ مذہب دشمن طبقہ اصلاحات کے لبادے میں ہی آیا ہے کیونکہ یورپ کے مطلق العنان بادشاہوں اور پوپ کے درمیان اختیارات واقتدار کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر پروٹسٹنٹوں نے حکمرانوں کو چرچ کے خلاف اکسایا۔ حکمرانوں نے بھی اپنے مفاد کی خاطر پروٹسٹنٹ تحریک کی حمایت شروع کردی۔ اس طرح پروٹسٹنٹ ملکوں میں کلیسا حکمرانوں کی مرضی کے تابع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے مذہب کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ضرورت کے مطابق اس کی

تشریح ہونے لگی۔ پروٹسٹنٹ تحریک کے سب سے بھیانک اثرات روحانی علوم پر پڑے۔ یورپ نے صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں سے روحانی علوم اور اسلامی تصوف کے طور طریقے حاصل کیے تھے حتیٰ کہ رومن کیتھولک چرچ کا سب سے بڑا پادری رچرڈ سینٹ وکٹور کے پاس بھی یہ کتابیں تھیں اور وہ اس پر کار بند تھا۔ پوپ اور کلیسا کا زور ختم ہوتے ہی مذہب سے بغاوت کرنے والے طبقہ نے روحانی علوم کے اثرات کو کھرچ کھرچ کر ختم کر دیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہ حال ہو گیا کہ جس کی زبان پر شیخ محی الدین ابن عربی کا نام آجاتا' اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ پروٹسٹنٹوں نے مذہب کے رہے سہے اثرات بھی معاشرہ پر سے ختم کر دیے جس کی وجہ سے ہر قسم کے ملحدانہ خیالات اور طرح طرح کے گمراہ کن افکار پھیلنے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ روحانی علوم کے خاتمہ کی وجہ سے مذہب پہلے ہی بے جان ہو چکا تھا' اب اس کی جگہ قدیم یونانی فلسفوں اور افکار نے لے لی۔ اسی دور میں سینٹ تھامس ایکوناس نے دوبارہ عیسوی الٰہیات و علم کلام کو مسلمانوں (ابن رشد) کے فلسفہ سے ہٹا کر ارسطو کے فلسفے پر قائم کیا۔ یہ بھی مذہب کے خاتمہ کی بنیادی وجہ بنی۔ پھر جیسے جیسے سائنس ارسطو کے افکار کو غلط ثابت کرتی گئی' عیسائیت پر سے لوگوں کا ایمان متزلزل ہوتا گیا۔ اور مذہب کو پس پشت ڈال کر جدیدیت کا آغاز ہوا۔

نشاۃ ثانیہ اور جدیدیت کا آغاز

یورپ میں جدیدیت کا آغاز ۱۴۵۳ء سے ہوا جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ (ترکی) فتح کیا اور یونانی علوم کے ماہر اپنی کتابیں لے کر بھاگے اور سارے یورپ میں پھیل گئے اور دوبارہ یورپ میں یونانی علوم کا چرچا عام کر دیا۔ اس دور کو نشاۃ ثانیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہزار سال تک یورپ میں مذہبی اثرات اور خارجی یعنی مسلمانوں کے اثرات غالب رہے اور یونانی افکار مردہ ہو گئے تھے۔ اب مذہب کمزور ہو کر دوبارہ مغرب کا اصل ذہن بیدار ہوا یعنی مذہب کی جگہ عقلی علوم نے لے لی۔ روحانیت کی جگہ مادیت نے اور وحی والہام کی جگہ فلسفہ نے لے لی۔ نشاۃ

ثانیہ کا اصل مطلب وحی پر مبنی نقلی علوم کو بے اعتبار سمجھنا' اس کی جگہ عقلیت پرستی و انسان پرستی اختیار کرنا۔ اب کائنات کا مرکز خدا نہیں بلکہ انسان سمجھا جانے لگا۔ اس دور کی خصوصیت مذہبی علوم پر یونانی علوم کو ترجیح دینا بھی ہے اور ہر بات کو خدا کے بجائے انسانی نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ چونکہ اب بھی مذہب کے کافی اثرات باقی تھے اس لیے خدا کے وجود سے صراحتاً" انکار نہیں کیا گیا لیکن خدا پر ایمان محض ایک رسمی چیز بن کر رہ گیا۔ اسی طرح آخرت سے بھی انکار نہیں کیا گیا مگر فرق یہ ہو گیا کہ پہلے اصل آخرت کو قرار دیا جاتا تھا اور دنیا کو فریب یا دارالغرور' اب آخرت بھی حقیقت اور دنیا اس سے زیادہ حقیقت۔ پھر کہا جانے لگا آخرت کس نے دیکھی اس کی فکر میں گھلنا بے کار ہے۔ جہاں تک ممکن ہو دنیا کا عیش و عشرت حاصل کرو۔ اسی دور میں سارے یورپ میں یہ فلسفہ عام ہوا کہ خدا کی دو کتابیں ہیں' ایک بائبل دوسرے فطرت۔ پھر آگے بڑھ کر کہا جانے لگا بائبل کو فطرت کے مطالعہ کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ یہ نقطہ نظر گلیلیو کا بھی تھا اس لیے کلیسا اسے سزا دی۔ بعد میں زور و شور سے یہ مشہور کیا گیا کہ کلیسا نے سائنس دشمنی میں سزا دی۔ اسی دور میں مطالعہ فطرت کا سائنسی طریقہ بیکن نے مقرر کر دیا یعنی چیزوں کی حقیقت صرف مشاہدے اور تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ چونکہ مذہب کا تعلق مابعد الطبعیات کے حقائق سے ہے جو تجربہ اور مشاہدے میں نہیں آتے' اس لیے مذہب خود بخود رد ہو گیا۔ اب مقصد حیات تسخیر فطرت یعنی طاقت کا حصول قرار پایا خواہ کسی طریقے سے ہو۔ اس میں مذہب کی عائد کردہ اخلاقیات کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ اب یہ معیار ٹھہرا کہ جو طاقت حاصل کرے وہ اچھا' جو طاقت حاصل نہ کرسکے وہ برا۔ پھر کہا جانے لگا کہ طاقت لامحدود ہونی چاہیے بلکہ صاف الفاظ میں کہا جانے لگا انسان کو خدا بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس بے لگام اخلاقیات کو اٹلی کے مشہور مفکر میکاولی نے مستقل فلسفہ کی حیثیت دی۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ طاقت کا حصول ہی مقصد ہے اور طاقت والوں (سلاطین وبادشاہوں) کو کسی مذہبی یا اخلاقی اصول کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے بلکہ

جس طرح بھی ہو' خواہ جھوٹ' دھوکہ' ظلم و ستم یا قتل عام سے طاقت حاصل ہو' حاصل کرنی چاہیے۔ اس وقت سے یورپ کا یہی مذہب و مقصد حیات قرار پایا۔ اس دور میں قوم و وطن کے نئے خدا تراشے گئے جنھوں نے یورپ میں حقیقتاً خدا کی جگہ لے لی۔ ساتھ ہی سائنسی ترقی کا دور دورہ ہوا۔ امریکہ دریافت ہوا۔ ہندوستان پہنچنے کا بحری راستہ دریافت ہوا۔ نئی نئی ایجادات ہوئیں۔ خاص طور پر بارود اور چھاپہ خانہ وجود میں آیا جسے نئے دور کی بنیاد کہا جاسکتا ہے۔ اسی دور میں فرانس کے مشہور مفکر مون ٹین (MONTAIGNE) نے فلسفہ پیش کیا کہ حق و صداقت کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ اضافی چیز ہے جو آدمی اور زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس نے کہا انسانی ذہن کی معراج معرفت یا علم کا حصول نہیں بلکہ تشکیک ہے کہ ہر چیز اور ہر عقیدے کو شک کی نظر سے دیکھا جائے۔ تشکیک کا یہ فلسفہ مغربی ذہن کا جزء لازم بن گیا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ یورپ کا انسان مادی ضروریات اور نفسانی خواہشات کی تسکین کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا۔ اس دور کی روح انفرادیت پرستی ہے۔ غور کیا جائے تو گزشتہ پانچ سو سال سے مغرب میں گمراہی کی جتنی شکلیں نمودار ہوئیں' وہ اسی انفرادیت پرستی کے بیج سے نکلی ہوئی شاخیں ہیں۔ اس ذہن نے مذہب کی اصلاح یعنی مذہب کو من مانے قلب میں ڈھالنے کا کام شروع کروایا۔ یورپ میں یہ دونوں رجحان ساتھ ساتھ ترقی کرتے گئے۔ پندرھویں صدی میں جرمنی میں مارٹن لوتھر نے مذہب پر پوپ کے اختیار واقتدار کو چیلنج کیا۔ اس نے کہا نجات کا مدار انفرادی اعمال اور ایمان پر ہے۔ ہر عام شخص اپنی رائے کے مطابق بائبل کا جو مطلب چاہے' اخذ کر سکتا ہے۔ اس نے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی اسناد کو ماننے سے انکار کیا اور تفسیر بالرائے کی پوری آزادی دی۔ یہ فکر یورپ کو جدیدیت کی طرف دھکیلنے کی اساس ہے اور تمام گمراہیوں کی جڑ ہے۔ جرمنی کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو مارٹن لوتھر کے اس نظریہ میں مذہبی طبقہ سے آزادی نظر آئی تو انھوں نے لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک کی بھرپور پشت پناہی کی جس میں ان کا سیاسی مفاد یہ تھا کہ کلیسا کا مذہبی اقتدار ختم ہو

جائے تو وہ بلا شرکت غیرے مطلق العنان حکمران بن جائیں چنانچہ سولھویں صدی میں رومن کیتھولک کلیسا کی مرکزیت ختم ہو کر ہر ملک کا قومی کلیسا قائم ہونا شروع ہوا جو اپنے ملک کے حکمرانوں اور عوام کی خواہشات کے تابع تھا۔ اس طرح مذہب سیاست کا تابع محض ہو گیا۔

عقلیت پرستی کا دور

یہ دور سترھویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر اٹھارویں صدی کے وسط تک ہے۔ سترھویں صدی کے وسط تک یورپ کے لوگ مذہب سے چھٹکارا حاصل کر کے یہ طے کر چکے تھے کہ انسانی جدوجہد کا میدان صرف مادی کائنات ہے اور انسان کا مقصد حیات کائنات کی تسخیر ہے۔ تسخیر کائنات کے لیے بیکن نے سائنسی طریقہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس کام کے لیے انسانی صلاحیتوں میں سب سے مفید چیز عقل تھی لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ صرف عقل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ عقل ہی کو معیار اور اصل قرار دے کر کائنات کی تسخیر کی جا سکتی ہے۔ اس دور میں یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ انسانی کی رہنمائی صرف عقل (جزئی) کر سکتی ہے نہ کہ مذہب۔ اس دور کے سب سے بڑے امام دو ہیں' ایک فرانس کا فلسفی اور ریاضی دان دے کارت (Descartes) اور دوسرا انگلستان کا سائنس دان نیوٹن۔ دے کارت یوں تو رومن کیتھولک پادری تھا لیکن مغرب کے ذہن کو مذہب سے متنفر کرنے اور مسخ کرنے کی جتنی ذمہ داری اس پر ہے' شاید کسی ایک فرد پر نہیں۔ فرانس کے ایک رومن کیتھولک مصنف نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "فرانس نے خدا کے خلاف جو سب سے بڑا گناہ کیا' وہ یہ ہے کہ دیکارت کو پیدا کیا؟"

دے کارت نے روح اور مادہ دونوں کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا جو ایک دوسرے سے بالکل آزاد اور خود مختار ہیں۔ یہ نظریہ مغربی ذہن پر اس طرح سوار ہوا کہ تین سو سال سے یہ جسم اور روح کی تفریق اس طرح چلی آ رہی ہے کہ مغربی ذہن ہر مسئلہ پر روح اور مادہ کے تقابل و تضاد ہی کے لحاظ سے غور کرتا ہے۔ اس کا خوفناک نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب روح کے معنی ہی بھول گیا اور ذہن یا

نفس کو روح سمجھنے لگا۔ یہ غلطی یونانی فلسفہ کے دور سے چلی آ رہی ہے۔ ارسطو وغیرہ یونانی فلسفی اس کی تعریف دو طرح سے کرتے ہیں' عقلی حیوان یا معاشرتی حیوان۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب کے ذہن و فکر پر ہر دور میں عقلیت پرستی یا معاشرتی نقطہ نظر ہی کا غلبہ رہا۔ اس دور کا دوسرا امام انگلستان کا نیوٹن ہے۔ اس کا سب سے بڑا سائنسی کارنامہ کشش ثقل کے قانون کی دریافت ہے۔ فطرت کا یہ قانون دریافت کر کے اس نے گویا دکھا دیا کہ کائنات کا نظام چند واضح قوانین کے ذریعہ چل رہا ہے۔ اگر انسان عقل کے ذریعہ انہیں دریافت کر لے تو وہ فطرت کو فتح کر لے گا۔ اگرچہ بعد میں سائنس نے نیوٹن کے تصور کو رد کر دیا مگر اس نے مغرب کا ذہن پر جو گہرا اثر ڈالا اور جو ذہنیت پیدا کی' وہ بڑھتی چلی گئی۔ اب کائنات کی تشریح و تفہیم کے لیے کسی خدا کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آگے چل کر ڈارون نے نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ یہ گویا نیوٹن کے فلسفہ کی اگلی کڑی ہے کہ خود بخود لاکھوں سال میں ایک معمولی جرثومہ سے ترقی کر کے انسان وجود میں آ گیا۔ ڈارون کی یہ تھیوری محض ایک خیالی مفروضہ تھا۔ اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں تھی مگر اسے یورپ میں "آناً فاناً" قبول عام حاصل ہو گیا۔ اس قبولیت کے پس پردہ اصل محرک مذہب بیزاری کا جذبہ تھا جو مسیحیت کے علم وسائنس سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا۔ ڈارون کی تھیوری سے لوگ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی مجبوری نہیں رہی۔ خدا کو ماننے کی ایک بڑی وجہ یا مجبوری یہ بھی تھی کہ خدا کو مانے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اس تھیوری سے خدا کے مفروضہ کی مجبوری نہیں رہی کیونکہ یہ نظریہ ارتقاء کائنات کی اس طرح تشریح وتوضیح کرتا ہے کہ کسی مرحلہ میں بھی خدا کو ماننے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ سائنس نے معلوم کیا کہ کائنات کچھ قوانین فطرت کے تابع ہے' پھر جدید تحقیق کی روشنی میں معلوم ہوا کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جسے تجزیہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً" نیوٹن کی تھیوری نے بتایا کہ آسمان کے تمام ستارے وسیارے فطرت کے کچھ ناقابل تغیر قوانین سے بندھے ہوئے ہیں اور انہی کے تحت حرکت

کرتے ہیں اور ڈارون کی تھیوری نے دعویٰ کیا کہ انسان کسی خاص تخلیقی حکم کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ مادی قوانین کے تحت ایک معمولی سا جرثومہ ترقی کرتے کرتے لاکھوں سال میں انسانی شکل اختیار کر گیا۔ اس فرضی وخیالی نظریہ کو انہوں نے قانون فطرت (Law of Nature) کا نام دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات اور انسان محض مادہ کے ذاتی عمل سے وجود میں آئے' انہیں کسی غیر مادی ہستی نے بالارادہ تخلیق نہیں کیا۔ یہ نظریہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ موٹر کار لوہے اور پٹرول کا اتفاقی مرکب ہے۔ لوہے اور پٹرول نے لاکھوں سال میں اندھے کائناتی عمل کے ذریعہ اتفاق سے کار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ نظریہ ارتقاء نے گویا خدا کے وجود کو بے معنی کر دیا کہ واقعات کی توجیہ کے لیے جب خود مادی کائنات کے اندر اسباب وقوانین مل رہے ہوں تو پھر اس مادی کائنات سے باہر ایک خدا کو فرض کرنے کی کیا ضرورت ہے' اس خیالی نظریہ کی بنیاد پر بعض سائنس دان انا ربکم الاعلی کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلا جرمن فلسفی کانٹ کہتا ہے "مجھے مادہ مہیا کر دو اور میں تم کو بتاؤں گا کہ دنیا اس مادہ سے کس طرح بنائی گئی" ہیگل نے دعویٰ کیا کہ پانی' کیمیاوی اجزاء اور وقت ملے تو وہ ایک انسان تخلیق کر سکتا ہے۔ نطشے نے اعلان کیا کہ اب خدا مرچکا ہے۔ آگے چل کر اٹھارویں صدی میں مزید ترقی کر کے ایک ذہنی خدا دریافت کر لیا گیا۔ اس نظریہ کا نام ہے خدا شناسی (Deism) اس کا حاصل یہ ہے کہ خدا کو پہچاننے کے لیے وحی کی ضرورت نہیں' عقل کے ذریعہ خدا تک پہنچ سکتے ہیں اور عقل سے ایسے اصول دریافت کیے جا سکتے ہیں جو سارے مذاہب میں مشترک ہوں۔ ان اصولوں کا مجموعہ صحیح مذہب ہوگا۔ جب انگریز ہندوستان آئے تو انہوں نے اس نظریہ کو میلہ خدا شناسی کے ذریعہ رواج دینے کی کوشش کی اور انیسویں صدی کے شروع میں اس نظریہ سے متاثر ہو کر ہندو مفکر راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ غرض سترھویں صدی سے یورپ میں مذہب کی جگہ عقل نے لے لی اور خدا کی جگہ معاشرہ کو دی گئی کہ فرد کا ہر عمل وفعل وقول معاشرہ کا پابند ہونا چاہیئے۔ پھر

انیسویں صدی میں اس کے خلاف رد عمل ہوا اور معاشرے کے بجائے فرد کو اہمیت دی گئی۔ اس میں اتنا غلو کیا گیا کہ معاشرہ کو فرد کے تابع کر دیا گیا۔ دراصل غلو ہمیشہ ہی مغرب کی فطرت کا ایک جز رہا ہے۔ بیسویں صدی میں اشتراکیت کے زیر اثر پھر دوبارہ معاشرہ کو خدا مانا جانے لگا۔ اب یورپ میں پھر اس کا رد عمل شروع ہے۔ مغرب چاہے معاشرہ کو اوپر رکھے چاہے فرد کو' دونوں نظریوں میں ایک بات مشترک ہے' وہ ہے انسان پرستی۔ بیسویں صدی کے بعض مفکرین انسان سے نفرت کرتے ہیں مگر ان کی نفرت کا مرکز بھی انسان ہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سے یورپ نے مذہب سے پیچھا چھڑا کر عقل کو اپنا رہنما بنایا' اس وقت سے روح اور مادہ' ذہن و جسم اور عقل و جذبات کے درمیان مسلسل کشمکش جاری ہے۔ اسی سے مغرب میں ذہنی و فکری انتشار پھیلا اور یہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی جڑ یہی تضاد ہے کہ مغرب وحدت اور تسکین مادہ میں تلاش کر رہا ہے جہاں کثرت' شکست و ریخت اور انتشار کے سوا کچھ مل ہی نہیں سکتا۔ اٹھارویں صدی کے اخیر میں انقلاب فرانس (۱۷۹۰ء) نے یورپ کے افکار و تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ انقلاب بادشاہ کو قتل کر کے جمہوری حکومت کے قیام سے وجود میں آیا۔ اس انقلاب کو دنیا میں جمہوریت کی پہلی فتح کہا جاتا ہے۔ اس کا نعرہ آزادی اخوت و مساوات تھا۔ یہاں ہمیں ان الفاظ کے مغربی معنی سمجھ لینا چاہئیں۔ اسلامی اخوت کے معنی ایک دینی و روحانی رشتہ کے ہیں جبکہ مغرب میں اس کے معنی ہر انسان کی جسمانی و نفسانی ضرورت کی یکسانیت کے ہیں اور مغرب میں مساوات کے معنی بھی صرف جسمانی و معاشرتی ضروریات کی یکسانیت کے ہیں کہ ہر انسان ہر اعتبار سے برابر ہے۔ اس کا منشا نہ صرف کھانا' کپڑا اور مکان میں یکسانیت ہے بلکہ ذہنی یکسانیت کے لحاظ سے حتیٰ کہ سب کی تعلیم بھی ایک جیسی ہو اور سب کو مذہب کی تفہیم و تشریح کا حق بھی یکساں ہو۔ ظاہر ہے مساوات کا یہ تصور غیر فطری اور فطرت کے حقائق کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام آدمی کو ہر چیز کا معیار بنا لیا گیا خواہ وہ ادب ہو' شاعری ہو' فلسفہ ہو یا مذہب۔ عام سوجھ بوجھ (Sense

(Common) کی پرستش ہونے لگی۔ اگر فلسفہ یا مذہب کی کوئی بات عام آدمی کی سمجھ میں نہ آسکے تو اسے تبدیل کر کے عام آدمی کی سمجھ کے مطابق بنانا ضروری قرار دیا گیا۔ اس انقلاب کے پیچھے دو متضاد رجحانات کار فرما رہے ہیں۔ ایک عقلیت پرستی کا نمائندہ والٹیئر اور دوسرے جذبات پرستی اور فطرت پرستی کا نمائندہ روسو۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں ساری دنیا پر مغرب کی سیاسی ومادی بالادستی کا دور شروع ہوتا ہے اور اس صدی کے اخیر تک پوری دنیا پر مغرب کی ذہنی' فکری' سائنسی و صنعتی اور سیاسی شہنشاہیت مسلط ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ صدی سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب کی صدی ہے۔ صنعتی انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام وذہنیت کو جنم دیا۔ اس کے ساتھ سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑوں نے اشتراکیت پیدا کی جو درحقیقت مغرب کی بے لگام سرمایہ داری کا رد عمل تھا۔ اب چونکہ معاشرتی انتشار اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اس لیے اس صدی میں سب سے زیادہ اہمیت سیاست کو حاصل ہو گئی۔ گویا مذہب کی جگہ اب سیاست نے لے لی۔ اس صدی کے تین خاص نظریے ہیں۔

ایک انفرادیت پسندی (Individualism) اس کا سب سے بڑا نمائندہ انگلستان کا مفکر جان اسٹیورٹ مل ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشرہ خدا کی تخلیق نہیں بلکہ فرد سے بنا ہے جو فرد نے اپنے فائدے کے لیے تخلیق کیا ہے لہٰذا معاشرہ کو خدا یا مذہب کے بجائے فرد کی مرضی کے تابع ہونا چاہئے۔ چونکہ اس وقت سرمایہ داروں کو معاشی معاملات میں من مانی اور آزادی کی ضرورت تھی اس لیے اس صدی میں اس نظریہ کو غلبہ رہا۔

اس کے رد عمل کے طور پر دوسرا نظریہ مثالیت پسندی (Idealism) ابھرا جس کا نمائندہ جرمن فلسفی ہیگل تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اصل چیز فرد نہیں بلکہ معاشرہ ہے۔ وہ فرد کو معاشرہ کے اس طرح تابع کرتا ہے کہ فرد کے کوئی حقوق باقی نہیں رہتے حتیٰ کہ فرد کا الگ وجود تک باقی نہیں رہتا۔ اس فلسفہ نے ہٹلر اور مسولینی کی آمریت پیدا کی۔ مغرب کے ان نظریات کے ظاہری اختلافات جو بھی ہوں' بنیادی

بات یہ ہے کہ مذہب کے ختم ہونے کے بعد یورپ میں ہر معاملہ میں انسانی ومعاشرتی نقطہ نظر سے غور کرنا مغرب کی عادت ثانیہ بن گیا۔

انیسویں صدی ہی میں فرانسیسی مفکر کومت (Comet) نے عمرانیات (Sociology) کی بنیاد رکھی اور ایک نیا فلسفہ پیش کیا جس کا نام ہے ثبوتیت۔ یہ فلسفہ پورے یورپ کے ذہن وفکر پر چھا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز حواس وحسیات کے ذریعہ ادراک میں آ سکتی ہے' صرف وہی حقیقت ہے' اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں۔ اگرچہ یہ ذہن ورجحان گزشتہ چار صدیوں سے پختہ ہو چکا تھا مگر کومت نے اسے باقاعدہ نظریہ وفلسفہ کی شکل دی۔ ظاہر ہے یہ نظریہ مذہب' وحی' روح' خدا سب ہی کی نفی کر دیتا ہے۔ اس فلسفہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ذہن ارتقاء کے عمل سے گزرتا رہا ہے۔ سب سے پہلے جادو کا دور تھا' پھر مذہب کا دور آیا' پھر فلسفہ کا' اب سائنس وعقل کا دور شروع ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق مذہب انسانی زندگی کے ضعف وناپختگی اور غیر ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے۔ یہ رجحان بیسویں صدی میں پوری طرح حاوی وغالب آ گیا اور کہا جانے لگا کہ مذہب کے بارے میں حق وباطل کا مسئلہ نہ اٹھایا جائے بلکہ مذہب وعقائد وعبادات کو عمرانی عوامل ومظاہر میں شمار کیا جائے اور مذہب کا مطالعہ بھی اسی نقطہ نظر سے کیا جائے جس طرح دوسرے عمرانی مظاہر کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر عقیدے اور مذہبی چیز کی تشریح عمرانی نقطہ نظر سے کی جانے لگی۔ ان کے نزدیک مذہب کی وہی حیثیت وقدر وقیمت قرار پائی جو کھیل تماشوں یا رسوم ورواج کی ہے۔ اس صدی میں عمرانی نقطہ نظر کے ساتھ تاریخی نقطہ نظر وجود میں آیا اور بہت مقبول ہوا۔ اس کا نام تاریخ پرستی (Historicism) ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کسی مذہبی عقیدے اور اصول پر اس کے صحیح یا غلط ہونے کی حیثیت سے غور نہ کیا جائے بلکہ اس کی تاریخ پر تحقیق کی جائے کہ کس زمانہ میں اس کی کیا نوعیت وحیثیت رہی۔ مذہب سے بے اعتنائی پیدا کرنے اور لوگوں کو برگشتہ کرنے میں یہ حربہ بہت کامیاب رہا۔ اس نظریہ کے ساتھ ایک اور نیا علم شروع ہوا' اس نے بھی مذاہب سے بے

اعتمادی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ ہے "مذاہب کا تقابلی مطالعہ" اس کا مقصد حق وصداقت تک پہنچنا نہیں بلکہ محض یہ دیکھنا کہ مختلف مذاہب کن کن باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے یا الگ ہیں جس طرح مختلف ملکوں کے کھیل تماشوں یا رسوم ورواج میں مماثلت تلاش کی جائے۔ غرض اس صدی میں یہ بات طے ہو گئی کہ ہماری حسی ومادی کائنات کے آگے کوئی حقیقت نہیں۔ خدا' آخرت' جنت' جہنم وغیرہ کوئی چیز نہیں۔ اس نظریہ کا دوسرا نام فطرت پرستی (Naturalism) ہے۔ غرض خدا کا مقام فطرت کو بخش دیا گیا۔ اسی صدی میں ایک اخلاقی نظریہ بہت مقبول ہوا' اس کا نام ہے افادیت پرستی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز بذات خود نہ اچھی ہے نہ بری۔ جو فائدہ مند ہے' وہ اچھی ہے اور جو فائدہ مند نہیں' وہ بری ہے۔ نیکی' بدی' ثواب' گناہ فرسودہ باتیں ہیں۔ اچھائی برائی کا معیار فائدہ ہے (یعنی صرف مادی فائدہ) اس نظریہ کے مطابق اخلاقیات کو مذہب سے علاحدہ کر کے ایک نئے اصول پر اس کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام ہے آزاد اخلاقیات کہ اخلاقیات کی بنیاد مذہب ووحی پر نہیں بلکہ عقل ودل پر ہے۔ دل جسے اچھا سمجھے وہ اچھی' جسے برا سمجھے وہ بری۔ کچھ لوگوں نے اس سے آگے بڑھ کر آزاد دینیات ایجاد کر لی جس کا دار ومدار انسان کی معصوم فطرت پر ہے۔ یہ لوگ حق وباطل' خیر وشر میں اس طرح امتیاز کرتے ہیں کہ جو چیز جذبات کے لیے تسلی بخش ہے' وہی حق اور خیر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذہب کو بھی محض جذبات کی تسلی وتسکین کا ذریعہ تصور کیا گیا۔ عقل پرستی ہو یا جذبات پرستی' درحقیقت یہ وہی نفس پرستی ہے۔ عقائد کے ساتھ عبادت کو بھی غیر ضروری قرار دے کر اس کا نام رسوم یا رسم ورواج رکھا گیا کہ عبادت کی کسی خاص شکل کی جو وحی سے بتائی گئی ہو' ضرورت نہیں بس خلوص کافی ہے۔ یہی اصل مذہب ہے۔ پھر اس سے ترقی کر کے (Free Thought) کی اصطلاح وضع کی گئی یعنی آزاد خیالی۔ اس کا مطلب ہے مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔ اس صدی میں جس چیز نے آزاد خیالی وتشکیک کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی' وہ انگریز سائنس دان ڈارون

کا نظریہ ارتقاء ہے جسے ہم قدرے تفصیل سے ذکر کر آئے ہیں۔ اس نظریہ کا کوئی حتمی ثبوت نہ ڈارون کو مل سکا نہ اس کے بعد کسی کو۔ یہ محض ایک خیالی وفرضی نظریہ تھا مگر اسے مذہبی عقیدے کی طرح قبول کیا گیا کیونکہ یہ لامذہب مغرب کے دل کی آواز تھا اس لیے بہت جلد پورے یورپ میں جڑ پکڑ گیا۔ گویا وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نظریہ نے مغرب میں مذہب کو یکسر مغلوب کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں مذہب کا تصور پہلے ہی دھندلایا ہوا تھا۔ عیسائیت میں خدا کا تصور توحید کے ساتھ نہ تھا' تثلیث کے ناقابل فہم چیستان نے پہلے ہی ہر خلاف عقل نظریہ کے قبول کرنے کے لیے ذہن کو ہموار کر دیا تھا۔ یورپ میں ہمیشہ ساری توجہ کائنات پر ہی مرکوز رہی تھی حتیٰ کہ یہاں مذہب کا تصور بھی کسی نہ کسی قسم کے نظریہ کائنات پر ہی رہا۔ نظریہ کائنات مذہب کا لازمی اور غالب جز رہا اس لیے جب بھی کائنات کے بارے میں سائنسی تصور بدلا' مذہب کو براہ راست زک پہنچی۔ اس کے برخلاف اسلام کی الہیات وعلم کلام کی بنیاد کسی کائناتی نظریہ پر نہیں اس لیے کائنات کے متعلق کوئی سائنسی نظریہ اسلام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بیسویں صدی میں مغرب نے روحانیت کے لفظ کو جدید معنی پہنا دیے یعنی روحوں سے باتیں کرنا' مستقبل کا حال بیان کرنا اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں۔ یہ حرکتیں یوں تو ہر زمانہ وقوم میں جاری رہیں لیکن اسے کبھی وقعت نہیں دی گئی مگر انیسویں صدی میں یورپ کے لوگوں کی بڑی تعداد اسی گورکھ دھندے کو مذہب کا ماحصل اور اصلی روحانیت سمجھنے لگی۔ بیسویں صدی میں یہ رجحانات اس قدر پھیل گئے کہ ان کی وسعت وطاقت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ پھر بعض سائنس دانوں نے ماورائے ادراک (Extra Sensory Perception) پر تجزیے کر کے ان حرکتوں کو سائنسی حیثیت سے بھی وقعت دے دی۔ اس طرح مغرب کی عقلیت کی تحریک بد ترین قسم کی ضعیف الاعتقادی پر منتج ہوئی۔

بیسویں صدی: جعلی مذاہب اور شہوت پرستی کا دور

موجودہ صدی نہایت اہمیت کی حامل اور انتہائی پیچیدہ ہے کیونکہ جدید سائنسی ایجادات اور ہائی ٹکنالوجی کی بدولت مغرب پوری دنیا پر مکمل تسلط اور اقتدار حاصل کر چکا ہے۔ اس تسلط کو مغرب کی مستحکم اقتصادیات اور میڈیا کی برتری نے مزید مستحکم کر دیا ہے۔ مشرقی اقوام تمام مغربی افکار و نظریات من وعن قبول کرتی جا رہی ہیں۔ بشمول عالم اسلام کے پوری دنیا پر مغربی نظریہ و فکر کے حامل لوگ مسلط کر دیے گئے ہیں۔ اس صدی میں ایک جوہری فرق یہ ہوا ہے کہ اب مذہب کی کھلی مخالفت کرنے کے بجائے تہذیب و کلچر کے نام پر مذہب کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ مذہب کی کھلی مخالفت کا دور دراصل پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۹ء) کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اب بیسویں صدی میں جعلی مذاہب و نظریات کا دور ہے۔ یہ صدی انتہائی پیچیدہ اس لیے ہے کہ یہ نہ تو محض عقل کا دور ہے نہ محض سائنس کا نہ محض اشتراکیت کا نہ محض الحاد کا۔ علماء کرام جب بھی کسی گمراہ نظریہ کو رد کرتے ہیں تو گمراہی کی دوسری شکل نمودار ہو جاتی ہے۔ پھر تیسری پھر چوتھی شکل میں۔ اس صدی میں ہر انسان کا ذہن مختلف و متضاد نظریات کی آماجگاہ بن چکا ہے اور وہ طے نہیں کر پا رہا کہ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ اگرچہ اس صدی میں افریقہ و ایشیا کے ممالک نے سیاسی طور پر آزادی حاصل کر لی مگر مغرب کی غلامی شکل بدل کر معاشی و اقتصادی اور فکری و ذہنی طور پر مزید مستحکم ہو گئی اور یہ مغرب کے مزید دست نگر ہو گئے۔ مغرب کے طاقتور ممالک کے مابین اقتدار کی کشمکش زمین و سمندر سے گزر کر فضا تک پہنچ گئی۔ یاد رہے اٹھارویں صدی میں عقل کی پرستش کی گئی تھی اور انیسویں صدی میں جذبات پرستی کا غلبہ تھا جبکہ بیسویں صدی اور نیچے گر کر جسم و شہوت کی پرستش کرتی دکھائی دیتی ہے اور اس کے لیے نئے نئے فلسفے بلکہ مذاہب پیدا کیے جا رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے خود ساختہ مذاہب گزشتہ صدیوں کی بے دینی سے زیادہ خطرناک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں افکار و نظریات اور فلسفوں کا دور ختم ہو چکا ہے' اب ان کی جگہ نفس و خواہشات اور جبلت نے لے لی ہے۔ اب مذہب کی جگہ روحوں

سے باتیں کرنے والی جھوٹی روحانیت نے اور عبادات کی جگہ خود ساختہ تفکر نے جس کا نام محاسبہ نفس رکھا ہے' نے لی ہے۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا فلسفی برگساں ہے جو عقل کے بجائے وجدان کا قائل ہے۔ اس کا نظریہ یورپ میں اس صدی کا سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے۔ اب اس صدی میں مغرب کا خدا ہے توانائی یا حیات جو مادی شکل میں نہیں بلکہ کہربائی لہروں کی شکل میں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ روح اسی توانائی کی ایک شکل ہے۔ یہ لوگ روح کو جسم یا مادہ ہی سے نکالتے ہیں۔ ہمیں ان کے پر فریب الفاظ سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہئے کہ یہ روح یا مذہب کے قائل ہو گئے ہیں۔ آج مغرب میں انسان کے ارتقاء کا نکتہ عروج یہ ہے کہ وہ ایک صحت مند جانور بن جائے۔ مغرب اس پر فخر کرتا ہے اور اس صفت (جانور پن) میں ترقی کرنا انسانیت کی معراج سمجھ رہا ہے۔ اس کا منتہا یہ ہے کہ انسان خود کو پوجنے لگے۔ بیسویں صدی میں مغرب کے ذہن پر عمرانیات کا خاص اثر ہے۔ جس طرح کیمونزم ہر انسانی سرگرمی کا ماخذ معاشیات کو قرار دیتا ہے' اسی طرح اس جدید فلسفہ میں اصل چیز انسان کی عمرانی زندگی اور اس کے مسائل ہیں۔ فلسفہ ہو یا مذہب' سب اس کی شاخیں ہیں۔ یہ لوگ صراحتاً مذہب کا انکار نہیں کرتے مگر ان کے نزدیک مذہب کی وہی حیثیت وقدر وقیمت ہے جو شادی بیاہ کی رسموں یا کھیل تماشوں کی۔ بیسویں صدی کا سب سے اہم نظریہ نئی نفسیات کا ہے جس پر سب سے گہرا اثر فرائڈ کا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے تمام افعال' اقوال اور افکار میں اصل حکمرانی عقل وشعور کی نہیں بلکہ لاشعور کی ہے۔ لاشعور سے مراد جبلتیں ہیں اور اس میں سب سے اہم جبلت (Sex Instinct) یعنی جنسی توانائی ہے یعنی انسانی کی جتنی ظاہری وباطنی سرگرمیاں ہیں' وہ سب بلا واسطہ یا بالواسطہ جنسیت سے نکلی ہیں یہاں تک کہ مذہب بھی۔ اس کو وہ زندگی کی بنیادی توانائی کہتا ہے۔ وہ تمام مذہبی تصورات اور متصوفانہ رموز کی جنسی تشریح کرتا ہے غرض کہ بیسویں صدی کی نئی نفسیات تمام تر نفس پرستی اور شہوت پرستی کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے نزدیک تمام تر نفسیاتی

اور ذہنی عوامل فی الحقیقت عضویاتی وجسمانی عوامل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب روح کو تو صدیوں سے بھول ہی چکا تھا' اب ذہن یا نفس سے بھی بیگانہ ہو کر آخر میں جسم یا نفسانی وجنسی خواہشات ہی رہ گئیں۔ بیسویں صدی میں بظاہر سائنس ومذہب قریب آ رہے ہیں مگر ہمیں اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ وہ جس چیز کو روح اور مذہب کہہ رہے ہیں' وہ سراسر مادی بلکہ نفسانی چیز ہے مثلاً" پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنا' بغیر کسی آلہ کے دوسرے ملک یا شہر کا حال بتانا' بغیر کسی ظاہری ذریعہ کے ذہن کو متاثر کرنا' اسی طرح کی دیگر ضعیف الاعتقادی وتوہم پرستی وغیرہ وغیرہ۔ اس صدی کے مفکر بظاہر مذہب کے دوست بن کر سامنے آ رہے ہیں۔ وہ اب مذہب پر اعتراض نہیں کرتے' شکوک وشبہات پیدا نہیں کرتے مگر جبلت پرستی یا جسم پرستی کو مذہب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے مغرب خدا کے وجود سے انکار کر رہا تھا تو اب نئے خدا ایجاد کر رہا ہے۔ یاد رہے پہلے سائنس اور عقلیت پرستی کی تحریک کی طرف سے جو اعتراضات مذہب پر ہوتے تھے' وہ جدید سائنس نے دور کر دیے ہیں لیکن مغرب کی مادیت گھٹنے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ پہلے سائنس اگر خدا اور روح سے منکر تھی تو جدید سائنس یہ تصور دیتی ہے کہ نعوذ باللہ خدا یا روح مادہ کے اندر یا کائنات وفطرت کے اندر ہی موجود ہے اور تجرباتی طریقے سے اس کی حقیقت دریافت کی جا سکتی ہے یعنی بیسویں صدی کی سائنس بے دینی کو دین بنا کر پیش کرتی ہے۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ یونانی فلسفہ مادہ کو قدیم مانتا تھا کہ مادہ کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی سائنس توانائی کو قدیم مانتی ہے اور کہتی ہے کہ توانائی کو نہ پیدا کیا جا سکتا ہے نہ فنا کیا جا سکتا ہے۔ بس اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ سائنس کے اس جدید اصول کا نام ہے (Conversion of Energy) اس کا کہنا ہے کہ فطرت یا حیات خود اپنی توانائی سے زندہ ہے (خدا کے بغیر) ظاہر ہے یہ نظریہ مذہب کے لحاظ سے انتہائی خطرناک ہے۔ اس سے متاثر ہونے والے مسلمان بھی خدا کو کائناتی توانائی کہنے لگے ہیں اور وہ خدا کو اس معنی میں زندہ وباقی سمجھتے ہیں جس معنی میں فطرت

یا حیات یا توانائی زندہ ہے۔ آج کی سائنس کا سب سے بنیادی اور انقلاب انگیز نظریہ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت ہے۔ اسی نظریہ نے ایٹم بم اور مصنوعی سیارے پیدا کیے۔ اس نظریہ کی بنیاد بعد رابع (Fourth Dimension) پر ہے۔ پہلے تین ابعاد تسلیم جاتی تھیں یعنی لمبائی' چوڑائی اور موٹائی۔ آئن سٹائن نے کہا کہ کسی چیز کو نوعیت سمجھنے کے لیے صرف تین ابعاد دیکھنا کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ چیز کس جگہ اور کس وقت وہاں ہے کیونکہ زمان ومکان کی تبدیلی سے چیز کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس نے زمان ومکان کو ہر چیز کا چوتھا لازمی بعد قرار دیا۔ اسے عام الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک چیز جو ایک جگہ اور ایک وقت میں صحیح ہے' وہ دوسری جگہ اور دوسرے وقت میں غلط ہو سکتی ہے۔ عام حالات میں دو اور دو کا مجموعہ چار ہوتا ہے لیکن دوسرے حالات میں یہ پانچ یا تین بھی ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ حق وصداقت کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ اضافی چیز ہے۔ زمان ومکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس نظریہ نے مذہب کے تمام تصورات وعقائد میں سخت انتشار پیدا کر دیا جو دائمی صداقتوں پر قائم ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید نظریات کا جو راست حملہ مذہب پر ہے اس میں چرچ وکلیسا کا کیا موقف ہے؟ پروٹسٹنٹ کلیسا کی تو بنیاد ہی جدیدیت یعنی مذہب سے بغاوت پر ہے' وہ شروع ہی سے جدیدیت کے ساتھ چل رہا ہے البتہ رومن کیتھولک کلیسا نے ہر دور میں ان نظریات سے مدافعت کی اپنی سی کوشش کی ہے مگر اب یہ کلیسا بھی جدیدیت سے دبتا جا رہا ہے اور اس کے سب مطالبے تسلیم کرتا جا رہا ہے۔ اس طرح عیسائیوں کے مذہبی عقائد ہر سال بدل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند سال کے اندر مغرب میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہے گی جسے رعایتاً" بھی مذہب کا نام دیا جا سکے۔ اب جدیدیت کا اصل مقابلہ اسلام سے ہے کیونکہ اسلام ہی دنیا کا واحد مذہب ہے جو آج بھی روز اول کی طرح اپنی صداقت وحقانیت پر قائم ہے۔

یورپ میں جدیدیت کی ابتداء یہاں سے ہوئی تھی کہ مذہب میں سند کا انکار کیا جائے۔ مارٹن لوتھر نے نہ صرف پوپ کو سند ماننے سے انکار کیا بلکہ ہر عامی شخص کو انجیل کی من مانی تشریح کا حق دیا۔ عالم اسلام پر بھی یہ اسی جدیدیت کا اثر ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کسی امام حتیٰ کہ سنت اور اجماع وقیاس تک کو سند ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کا ثبوت قرآن سے مانگتا ہے۔ اس خود رائی اور آزاد روی کے ذہن کو بیسویں صدی میں جارحانہ سلفیت نے تقویت پہنچائی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ائمہ مجتہدین پر سے اعتماد اٹھانے کی زد کہاں تک پہنچے گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ حتیٰ کہ عمر فاروقؓ کے فیصلوں کو بے دھڑک رد کر دیا جاتا ہے اور قرآن وسنت کے نام پر اپنی ذاتی رائے وخواہش پر چلنے کا ذہن بن رہا ہے۔ جدید طبقہ دینی لحاظ سے مستند وغیر مستند' سچا جھوٹا' متقی فاسق سب کو برابر قرار دیتا ہے حتیٰ کہ تاریخ کی بے سند قصوں کی کتابوں کو بے تکلف قرآن کی طرح سند میں پیش کر دیتا ہے۔ اگر اس پر علمی کام نہ ہوا تو نئی نسل کو سب سے زیادہ نقصان اسی سے پہنچے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ علماء کرام مغرب کی ان گمراہیوں سے پوری انسانیت کو نجات دلانے کے لیے گوشہ عافیت سے نکل کر میدان عمل میں آئیں۔ مغرب میں اگرچہ اس وقت مذہب سے وحشت وبے گانگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے مگر جدید سائنس کا رخ مذہب اور خدا کے اثبات کی طرف مڑتا دکھائی دیتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے سائنس دانوں کی کائنات کے متعلق مادی توجیہ وتشریح کو پوری طرح مسترد کر دیا ہے۔ انگریز ماہر ریاضیات وفلسفی الفرڈ ارتھ وائٹ ہیڈ کے مطابق جدید سائنسی تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ فطرت بے روح مادہ نہیں بلکہ زندہ فطرت ہے (Nature is live) مشہور سائنس دان آرتھر اڈنگسٹن کی تحقیق کے مطابق کائنات ایک ذہنی شے ہے اور معروف ریاضیاتی وطبعیاتی عالم سر جیمز جینز اپنی جدید تحقیقات کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

The universe is a universe of thought.

یعنی کائنات مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے۔ اسی طرح جے ڈبلیو سلیوں کے الفاظ میں کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے۔ غرض بیسویں صدی کی جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق تبدیلی مابعد الطبیعاتی بنیادوں پر واقع ہوئی ہے۔ ان جدید تحقیقات کی روشنی میں اب کائنات محض ایک ذہنی تصور ہو کر رہ گئی ہے۔ اس علمی وسائنسی مطالعہ کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے۔ غور کیا جائے کہ تو یہ جدید تحقیقات اپنی نوعیت کے اعتبار سے الحاد کی تردید اور مذہب کی تصدیق کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اب خود سائنس کے جدید نظریات کی رو سے خدا تک پہنچنے کے لیے ایک قدم باقی رہ گیا ہے یعنی سائنس اس نتیجہ تک تو پہنچ چکی ہے کہ کائنات ایک ذہن ہے' اب ذہن سے ایک علیم وخبیر ہستی تک پہنچنا سائنس کا اگلا قدم ہو سکتا ہے۔ اگر اس زریں موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور مغرب کو علم و تحقیق کی روشنی میں قائل ومائل کیا جا سکے تو یہ مغرب پر سب سے بڑا احسان ہوگا اور ۔ بمصداق الناس علی دین ملوکھم کے اس کے اثرات مغرب کے ذریعہ "آنا" فانا" پوری ربع مسکون پر پڑ سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے میڈیا اور ابلاغ کی سہولتوں نے اسے اتنا سہل بنا دیا ہے کہ ہم اپنی جگہ بیٹھے ہوئے پوری دنیا کے انسانی دماغوں پر دستک دے سکتے ہیں۔ شاید اس طرح آخری دور کے متعلق مخبر صادق ﷺ کی بشارت کہ ہر کچے پکے گھر میں اسلام کا کلمہ گونجے گا' ہمارے ہاتھوں انجام پا سکے۔ اس سے بڑھ کر دنیا و آخرت کی سرفرازی وسعادت کیا ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے علمی ودینی اداروں سے یونانی دور کے فرسودہ علوم کی متعفن اور گلی سڑی لاشوں کو خارج کر کے انہی یونانی علوم کے بطن سے نکلے ہوئے جدید نظریات وافکار اور سائنسی علوم کو اپنی علمی و تحقیقی توجہ کا مرکز بنائیں کیونکہ اب یہ الحاد وخدا فراموشی کا عفریت مشرق ومغرب بلکہ ملت اسلامیہ کے نونہالوں کو لقمہ بنانے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری یہ صدا ان دردمند دلوں تک پہنچے گی جو پوری دنیا پر اتھاہ گمراہیوں کے منحوس سائے گھرے ہوتے دیکھ کر بے چین ومضطرب

ہیں۔ اگر ان کی اس بے چینی واضطراب کے ساتھ عملی اقدامات اور علمی و تحقیق کاوشیں شامل ہو جائیں جس طرح دوسری صدی ہجری میں علماء کرام نے یونانی علوم وفلسفہ میں مہارت تامہ حاصل کر کے پھر ژرف نگاہی سے اس پر تنقید کر کے انسانی ذہنوں پر سے اس کی مرعوبیت ختم کی اور اس کے تفوق وبرتری کا بت پاش پاش کر دیا تھا' اسی طرح آج ضرورت ہے کہ علماء مغرب کے افکار و فلسفوں کا بغور مطالعہ کر کے ان نظریات و فلسفوں کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر کس کر ان کے مضر وگمراہ کن اجزا کو علمی طور پر رد کر دیں تو یہی سائنس اور جدید علوم انسانیت کے لیے مذہب اور خدا تک رسائی کا زینہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح دنیا ایک بار پھر یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر دیکھ سکتی ہے۔

عہد وپیمان اور یورپین اقوام

خلیجی جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران بھی امریکی صدر بش امریکی وزیر دفاع اور وزیر خارجہ کے علاوہ برطانیہ کے وزیر اعظم بار بار یہ کہتے رہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ کا تنازعہ پائیدار اور مستقل بنیادوں پر حل کیا جائے گا۔ بظاہر اپنے عہد وپیان کو پورا کرنے کے لیے ہر طرف امن کانفرنس کا چرچا ہے اور آج کل اخبارات امریکی امن کانفرنس کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ سادہ لوح عرب ان عہد وپیان کے ایفا کے منتظر ہیں۔

آیئے آج اس بات کا جائزہ لیں کہ عہد وپیان کی یورپین اقوام کے نزدیک کیا وقعت وحیثیت رہی ہے؟ اکثر مشرقی اقوام کے نزدیک عہد شکنی انتہائی رذیل خصلت سمجھی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاں عہد شکنی سے بڑھ کر کوئی چیز قابل نفرت نہیں تھی اور اسلام نے تو ہر حالت میں ایفائے عہد کی تعلیم دی ہے۔ لیکن ہمیں جن اقوام سے سابقہ ہے' ان کے نزدیک عہد توڑ دینا یا عہد سے مکر جانا ایک آرٹ وہنر کی حیثیت رکھتا ہے۔ عہد وپیان کیے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ موقع ملتے ہی اسے پیروں تلے روند ڈالا جائے۔ ان اقوام کے نزدیک عہد شکنی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر ذرہ برابر بھی خفت و شرمندگی محسوس کی جائے بلکہ یہ وہ صفت ہے جس پر انہیں ہمیشہ فخروناز رہا ہے۔ اگر آپ اٹلی کے معروف سیاستدان میکاولی کی "دی پرنس" پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ پونے پانچ سو سال قبل اس مغرب کے استاد نے اس آرٹ کے کیسے کیسے گر سکھائے ہیں اور عہد سے مکر جانے کے نت نئے ہتھکنڈوں کی تعلیم دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد وپیان کر کے اس کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے فراموش کر دینا اور اپنے اس فن پر فخر کرنا یہ

یورپین اقوام کی سرشت میں داخل ہے۔ آیئے تاریخ کے حوالہ سے اہل یورپ کے اس فن شریف پر ایک نظر ڈالیں۔

براعظم امریکہ میں یورپین اقوام کا ورود مسعود اور اصل امریکی باشندوں ریڈ انڈین سے باہمی چپقلش کی تاریخ بڑے بصیرت افروز سبق اور یورپین اقوام کے مزاج و نفسیات سمجھنے کے لیے سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ یاد رہے کہ تمام ریڈ انڈین قبیلے جنگجو نہ تھے بلکہ بیشتر قبائل آپس میں مختلف معاہدے کر کے امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نو وارد یورپین حسب عادت ان کے ساتھ معاہدے کرتے اور چند دنوں میں مکر جاتے اور ان کی آبادیوں پر چڑھ دوڑتے۔ انہیں پامال کر کے سرزمین کے مالک بن بیٹھتے اور انہیں نکال باہر کرتے۔ پھر دوسرا معاہدہ کر لیتے۔ غریب ریڈ انڈین کو کیا پتہ کہ عہد شکنی یورپین اقوام کے نزدیک فخر و مباہات کی صفت ہے۔ اسی طرح یہ معاہدے ہوتے اور ٹوٹتے رہے۔ ۱۸۳۰ء میں ایک اور معاہدہ کی رو سے ریڈ انڈین اقوام کے لیے "مسی سپی" کا مغربی علاقہ خاص کر دیا گیا۔ ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ان غریبوں کو مزید مغرب میں دھکیل دیا گیا۔ اسی طرح اصلی مقامی باشندوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا رہا۔ ریڈ انڈین ہر معاہدے میں نیک نیتی سے شامل ہوتے۔ بعض دفعہ بغیر مزاحمت کے علاقے خالی کر دیتے۔ جب ظلم و جبر کی انتہا ہو جاتی تو اپنے دفاع میں ہتھیار بھی اٹھا لیتے لیکن سفید فام اقوام کے جدید اسلحہ اور عیارانہ چالوں کے سامنے مات کھا جاتے۔ غرض امریکہ کی تاریخ ریڈ انڈین قبائل کے ساتھ عہد شکنی اور نسل کشی کی بھیانک اور لامتناہی سلسلہ کی تاریخ ہے۔ ساتھ ہی یورپین اقوام کی سفاکی کی المناک داستان۔ کوئی ظلم و ستم ایسا نہیں جو ان نہتے اور کمزور قبائل پر روا نہ رکھا ہو۔ بے قصور بچوں' عورتوں اور بوڑھوں تک کا اس بے رحمی و سفاکی سے قتل عام کیا جاتا کہ علاقہ سے ان کا وجود ختم ہو جاتا۔ الغرض ان قبائل کی نسل کشی اور قتل عام کا سلسلہ ۱۸۹۰ء سیوکس کے کیمپ میں مقیم سٹنگ بل قبیلہ کے قتل عام سے اختتام کو پہنچا۔ اس طرح امریکہ کے اصل باشندے جو

صدیوں سے اپنے ملک میں آرام وسکون کی زندگی بسر کر رہے تھے، صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ البتہ عبرت کے طور پر ان میں سے چند ایک قبائل بچ رہے جو دوسرے درجے کے شہری بن کر غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے۔ اس طرح یورپین اقوام اس وسیع وعریض براعظم کی وارث مالک بن بیٹھیں۔

برصغیر میں بھی انگریز انڈیا کمپنی کے سوداگروں کے بھیس میں وارد ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کے مالک بن بیٹھے سلاطین مغلیہ سلطان ٹیپو نواب سراج الدولہ اور دیگر سینکڑوں ہندو مسلمان حکمرانوں کے ساتھ ان کے عہدو پیمان اور معاہدوں کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یورپین اقوام کے نزدیک معاہدے کیے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ موقع ملتے ہی اس کے پرخچے اڑا دیے جائیں۔

اب آیئے تاریخ کا ایک اور ورق پلٹیں اس صدی کے اوائل میں جب برطانیہ و فرانس نے دولت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کی اسکیم تیار کی تو مارچ ۱۹۱۵ء میں باہمی بندر بانٹ کاایک خفیہ معاہدہ کیا ایک طرف عرب لیڈروں کو کامل یقین دلایا جاتا رہاکہ یہ جنگ محض ان کو ترکی کے پنجہ ستم سے آزاد کروانے اور ان کی ایک خود مختار سلطنت قائم کرنے کے لیے لڑی جا رہی ہے عربوں کے ساتھ یہ چال چلی گئی کہ باہمی تقسیم کی اس معاہدے کو بالکل خفیہ رکھا گیا عرب لیڈروں کو مل کر انہیں یہ یقین دلایا گیا انہیں ایک آزاد ار خود مختار سلطنت قائم کر دی جائے گی آزادی کے اس خواب نے عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی چنانچہ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے سرہنری میک موہن کی معرفت اتحادیوں سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے ان کی پوری نصرت و حمایت اتحادیوں کے ساتھ ہوئی اور اس کے عوض انہیں اس امر کا ایک کاغذی میثاق مل گیاکہ اختتام جنگ کے بعد عرب سلطنت وجود میں آجائےگی اس معاہدہ کے بعد جون ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے ترکی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور ترکوں کے خلاف عراق شام اور فلسطین میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور چند ہی ماہ کے اندر یہ امر یقینی معلوم ہونے لگا

کہ ممالک عربیہ میں ترکی سلطنت نہیں ٹھہر سکے گی اور برطانیہ و فرانس کے مشترکہ مقاصد ضرور حاصل ہو جائیں گے ۱۹۱۶ء میں دوبارہ برطانیہ و فرانس میں گفت و شنید ہوئی اور دوسرا خفیہ معاہدہ ہوا جو معاہدہ سائیکس پیکو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے میں طے پایا کہ عراق کلیتا" برطانیہ کے قبضہ میں رہے گا اور شام فرانسیسی سلطنت کے دائرے میں رکھا جائے گا۔ فلسطین ایک بین الاقوامی علاقہ اور حیفہ اپنی بندرگاہ سمیت برطانیہ کے زیر اثر رہے گا۔ اس طرح باقی ماندہ علاقوں پر بندر بانٹ کر لی جائے گی دوسری طرف ۱۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو جنرل اسٹیلے ماڈ بغداد میں داخل ہوا تو اس نے اہل عرب کے نام ایک عام اعلان شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"ہم آپ کے شہر میں فاتحانہ داخل نہیں ہوئے ہیں ہم آپ کے دشمن نہیں بلکہ نجات دہندہ ہونے کی حیثیت سے آپ کو آزادی دلوانے آئے ہیں۔ بغداد کے باشندوں کو جان لینا چاہئے کہ ہم ان کے ملک پر حکومت نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے علماء وفقہا کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوں ان کا ملک اک مرتبہ پھر آزاد ہو اور اس میں ایسے آئین و قوانین نافذ ہوں جو ان کی مقدس شریعت اور قومی روایات کے مناسب ہوں۔"

لیکن جب ان وعدوں پر عمل کا وقت آیا تو دیکھا کہ شام کے سواحل پر فرانس کی فوجیں مسلط ہیں اور عراق و فلسطین میں انگریزوں کا پنجہ استبداد گڑا ہوا ہے تو عرب لیڈروں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ سراسر دھوکہ ہوا ہے آخر انہوں نے امیر فیصل بن حسین کی قیادت میں آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ یہ تھا عرب قومیت کا آغاز برطانیہ و فرانس نے جب دیکھا کہ عرب قومیت کی تحریک ترقی کر رہی ہے تو اپریل ۱۹۲۰ء میں بعان ریمو کے مقام پر دونوں نے عربوں کے خلاف یہ تصفیہ کر لیا کہ عراق و فلسطین برطانیہ کے قبضے میں رہیں گے اور شام پورا کا پورا فرانس کے قبضہ میں۔ یہ تقسیم کسی طرح بھی اس تقسیم سے مختلف نہ تھی جو چور اور ڈاکوؤں کا گروہ کسی گھر کو لوٹنے کے بعد کیا کرتے ہیں مگر یورپ کے مہذب ڈاکوؤں نے اس کو بھی حق و انصاف کا رنگ

دینے کی کوشش کی اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے ظاہر کیا کہ یہ تینوں ممالک ان کو جمعیت اقوام کی طرف سے انتدابا" دیے گئے ہیں اور انتداب کے معنی یہ کہ جمعیت اقوام نے برطانیہ و فرانس سے درخواست کی کہ برائے کرم ان پسماندہ علاقوں کو اپنی سرپرستی لے لیں جبکہ یہ کھلا فراڈ تھا کیونکہ برطانیہ و فرانس کی سپریم کونسل یہ بندر بانٹ کا فیصلہ ۲۵ اپریل ۱۹۲۰ کو کر چکی تھی جب کہ جمعیت اقوام کا پہلا اجلاس ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو جنیوا میں ہوا اس کی حقیقت یہ تھی کہ انگلستان اور فرانس نے پہلے خود دھوکہ دے کر ان علاقوں پر جبرا" قبضہ کیا پھر جمعیت اقوام کے وجود سے پہلے اس کی طرف سے اپنے نام انتداب کی درخواست کا مسودہ تیار کیا جب انکے منصوبے کے مطابق جمعیت اقوام وجود میں آ گئی تو اس درخواست پر دستخط کروا لیے اس سے جہاں یورپین اقوام کے عہد و پیان کی حقیقت عیاں ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ جمعیت اقوام ہو یا موجودہ اقوام متحدہ ان کی حیثیت مغربی اقوام کے گھناؤنے اور مذموم کرتوت کو آئینی شکل دینے کے لیے ربڑ اسٹامپ کی رہی ہے۔

ان اقوام کے عہد و پیان کی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک قدم اور بڑھائیے ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جب عربوں نے اسرائیل کے ناقابل تسخیر ہونے کا بھرم توڑ دیا اور مصری و شامی یلغار کے آگے اسرائیلی بھاگتے نظر آئے اور اسرائیل کی مکمل شکست کا خدشہ پیدا ہونے لگا تو فورا" امریکہ اور روس نے بلند آہنگ میں مقبوضہ عرب علاقوں کے انخلا کا وعدہ کرتے ہوئے قرارداد نمبر ۲۴۲ پیش کر دی عربوں نے انکے وعدوں پر اعتماد کر کے پھر جیتی ہوئی بازی ہار دی اصل قرارداد جو فرانسیسی میں تھی' اس میں مقبوضہ علاقوں سے انخلاء کے الفاظ تھے جب کہ عربوں کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے انگریزی ترجمہ میں تمام مقبوضہ علاقوں کے انخلاء کے الفاظ شامل کیے گے چنانچہ گزشتہ ۱۷ سال سے اس قراردلو کے الفاظ کی تشریح ہو رہی ہے اگر کبھی بھولے سے اقوام متحدہ میں اس قرارداد کا تذکرہ آجاتا ہے تو تمام مقبوضہ علاقوں اور مقبوضہ علاقوں کے لفظی گورکھ دھندوں کی موشگافیاں

قابل دید ہوتی ہیں اور قرارداد ۲۴۲ کی اسرائیلی تشریح کے مطابق اسے ایک انچ زمین بھی واپس کرنے کی ضرورت نہیں ماہرین لسانیات کے مطابق زبانیں قوم کے مزاج و نفسیات کی غماز ہوتی ہیں چنانچہ یورپین السنہ خصوصاً" انگریزی و فرانسیسی میں الفاظ کو من چاہے معنی پہنانے کی جتنی وسعت ہے' شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔

ان دنوں اسپین میں جو امن کانفرنس کے مذاکرات ہونے جا رہے ہیں' سادہ لوح عرب اس سے آس لگائے بیٹھے ہیں کہ امریکہ ان کے غلامانہ کردار کے عوض شاید امن بھیک میں دے دے گا اور وہ اپنے طور پر ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لیے مستعد ہو بیٹھے ہیں۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے' اس کا اقتصادی بائیکاٹ ختم کرنے' اسے اپنے آبی ومعدنی وسائل سے نوازنے تک ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے اسرائیل کی سرپرستی بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بدلے میں صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسرائیل انہیں عافیت سے رہنے دے اور ان کے عیش کو مکدر نہ کرے امریکہ بھی سمجھتا ہے کہ اس سے بہتر موقع پھر شاید نہ ملے عراق کی قوت پاش پاش کی جاچکی ہے۔ عربوں کی باہمی منافقت و گروپ بندی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے سعودی عرب و خلیج کی ریاستیں اسرائیل سے زیادہ فلسطینیوں کو اپنا دشمن سمجھ رہی ہیں امریکی و یورپی نقطہ نظر سے گویا لوہا گرم ہے اور نادر موقع ہے کہ اسرائیل کی ہر بات منوا لی جائے اور منتشر عربوں کو ڈرا دھمکا کر دستخط کروا لیے جائیں معلوم ہوتا ہے کہ عرب اقوام ایک بار پھر یورپین وعدوں پر بھروسہ کر کے اپنی بربادی کی دستاویز پر دستخط کرنے جارہی ہیں۔

نئے عالمی نظام کے خوش نما مقاصد

یکم ستمبر ۱۹۹۱ء کے اخبار جنگ کے صفحہ اول پر "امریکہ کا نیا عالمی نظام اور دنیا میں جمہوریت" کے عنوان سے جناب سہیل وڑائچ صاحب کا مضمون نظر سے گزرا جس میں موصوف نے امریکی فلاسفروں کے حوالہ سے نئے امریکی عالمی نظام کے چار مقاصد بیان کیے ہیں:

۱۔ دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کا خاتمہ ہو۔

۲۔ دنیا بھر میں جمہوریت کا نظام رائج ہو اور کسی بھی ملک میں عوام کی آزادی یا اظہار رائے پر کوئی پابندی نہ ہو۔

۳۔ فری مارکیٹ اکانومی کا نفاذ جس سے دنیا بھر سے استحصال کا خاتمہ ہو۔

۴۔ دنیا کے تمام ممالک اپنے جھگڑوں کو لڑائیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ اقوام متحدہ میں گفت وشنید کے ذریعے طے کریں۔

بقول ان امریکی فلاسفروں کے اب دنیا میں کسی کی یہ ہمت نہیں ہے اور نہ امریکہ یا اقوام متحدہ اس کی اجازت دیں گے کہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ کر لیا جائے اور اگر تمام ملکوں کی سلامتی وتحفظ کی گارنٹی امریکہ یا اقوام متحدہ مہیا کرتے ہیں تو پھر ان ملکوں کو فوج رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ بقول ان امریکی فلاسفروں کے اس نئے عالمی نظام کی بدولت یہ دنیا جنت نظیر بن جائے گی۔ ہر طرف امن کا دور دورہ ہو گا' استحصال کا خاتمہ ہو کر دنیا پر جمہوریت وخوشحالی کا پرچم لہرائے گا۔

اب آیئے واقعاتی اور عملی دنیا میں ان خوشنما دعووں کا جائزہ لیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمہ کا اطلاق کس پر ہو گا؟ کسی یورپی ملک' اسرائیل' بھارت' جنوبی افریقہ' ارجنٹینا وغیرہ وغیرہ پر؟ نہیں نہیں بلکہ

امریکی طرز عمل اور حکمت عملی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ کوئی مسلم ملک ایٹمی طاقت نہ بننے پائے۔ عراق کی تباہی کا اصل سبب اس کا نیوکلیر اور کیمیکل اسلحہ بنانے میں استعداد حاصل کر لینا تھا۔ اب نظر کرم پاکستان پر ہے۔ پاکستان کی ہر قسم کی امداد بند کرنے کے علاوہ امریکی ذرائع ابلاغ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے متعلق جو مہم شروع کر رکھی ہے' اس کا مقصد بھارت و اسرائیل کے ذریعہ کہوٹہ کے پلانٹ کو تباہ کرنا ہے۔ نئے عالمی نظام کے تحت موثر انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ آئندہ عراق' ایران' پاکستان' مصر' سعودی عرب سمیت پوری مسلم دنیا کو نہ ہی متذکرہ بالا ہتھیار بنانے میں کوئی مدد دی جائے اور نہ ہی میزائل بنانے کے لیے کوئی پرزہ فراہم کیا جائے۔ اس پر پوری شدت سے عمل درآمد کروانے کے لیے پانچ بڑی طاقتوں کی کانفرنس بلوائی گئی ہے۔ امریکہ نے مسلم دنیا کا ناطقہ بند کرنے کے انتظامات کو آخری شکل دے دی ہے۔ پاکستان چین سے جو دفاعی سامان خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے اس پر عمل درآمد کا راستہ بند کرنے کا قانون بنایا گیا ہے۔ امریکہ چین پر یہ پابندی بھی عائد کرنا چاہتا ہے کہ وہ پاکستان' ایران' لیبیا' شام وغیرہ کسی مسلم ملک کو دفاعی سامان اور جدید ٹیکنالوجی منتقل نہیں کرے گا۔ ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ایٹمی ہتھیار ایک طرح سے امن کی ضمانت بھی فراہم کرتے ہیں مثلاً" پاکستان کے پاس ایٹمی اسلحہ ہو تو بھارت کو حملہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑے گا۔ اگر تیسری دنیا میں جنگیں نہیں ہوں گی تو روایتی ہتھیار کون خریدے گا؟ اور سپریم پاور کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تیسری دنیا کے ممالک کو اکسا کر لڑوانے کا عمل جاری رہے تا کہ اسلحہ ساز فیکٹریاں چلتی رہیں اور تیسری دنیا پر دہشت طاری رہے۔

جہاں تک جمہوریت اور آزادی رائے کا تعلق ہے' شہنشاہ ایران سے لے کر نکاراگوا' میکسیکو' فلپائن سمیت دنیا بھر کے ڈکٹیٹروں اور شاہوں کی سرپرستی کون کرتا رہا؟ آج بھی تیسری دنیا کی غیر منتخب حکومتوں کا سرپرست کون ہے؟ اور کیا یہ جمہوریت کا نسخہ شفا مصر و شام' سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کے لیے بھی

ہے؟ ضیاء الحق مرحوم کی شخصی حکومت کو امریکہ بہادر کی جتنی سرپرستی حاصل رہی' کیا آج کی منتخب حکومت کو بھی حاصل ہے؟ غرض یہ جمہوریت و آزادی رائے کا نسخہ بھی امریکی مفادات کے تابع ہے۔

امریکی عالمی نظام کا تیسرا نکتہ فری مارکیٹ اکانومی کا ہے۔ آج کی دنیا میں سیاست و معیشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ امریکی داخلہ وخارجہ پالیسیوں کی تو بنیاد ہی اقتصادیات پر رکھی گئی ہے۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ جہاں سیاسی واقتصادی مفادات کے حصول میں سی آئی اے اور وہائٹ ہاؤس میں اقامت گزیں گھاگ سیاست دان ناکام ہو جاتے ہیں' وہاں وال سٹریٹ کے اقتصادی ماہرین کام آتے ہیں۔ جہاں امریکی خارجہ پالیسی ناکام رہتی ہے وہاں ڈالر ڈپلومیسی کامیاب رہتی ہے اور وہ مطلوبہ نتائج دے کر ہمیشہ سرخروئی حاصل کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر آج پوری دنیا امریکی سرمایہ داروں کے رحم وکرم پر ہے۔ وہ ڈالر کے زر مبادلہ کو اوپر کر دیں تو دنیا اوپر اٹھ جاتی ہے۔ نیچے کر دیں تو نیچے آ جاتی ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان میں اکثریت امریکی نژاد یہودیوں کی ہے جو نہ صرف امریکی معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں بلکہ ڈالر یا (ڈالر ڈپلومیسی) کے ذریعہ پوری دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچانے کی پوزیشن میں ہیں۔ یاد رہے کہ روس پر موجودہ امریکی فتح نہ امریکی خارجہ پالیسی کی فتح ہے اور نہ اسلحی فتح ہے بلکہ صرف اور صرف اقتصادی یا ڈالر ڈپلومیسی کی فتح ہے۔ جس طرح گھنے درخت کے نیچے کوئی دوسرا درخت پرورش نہیں پا سکتا اسی طرح موجودہ امریکی (یہودی) مالیاتی نظام کی موجودگی میں کوئی اور نظام یا کوئی اور قوم (اقتصادی طور پر) پنپ نہیں سکتی۔ لہٰذا فری مارکیٹ اکانومی کا مقصد دنیا پر ڈالر کی یا امریکی حکمرانی ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں امریکی یہودی لابی کی اجارہ داری ہے۔

اب آیئے اس عالمی نظام کے چوتھے نکتہ کی طرف کہ تمام ممالک اپنے جھگڑوں کو لڑائیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ اقوام متحدہ میں گفت وشنید سے طے کریں۔ دنیا جانتی ہے کہ اقوام متحدہ کی حیثیت شروع ہی سے امریکی یورپی مفادات کے لیے

ایک آلہ کار ادارے کی رہی ہے۔ تیسری دنیا کے معاملات میں دخل اندازی اور ان پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے یہ ایک سنہرا جال ہے۔ ویٹو کا حق اقوام عالم سے بے انصافی اور دھاندلی کا بین ثبوت ہے جس کے معنی دنیا کے چار ارب انسانوں پر چند کروڑ کی مرضی تھوپنے کے ہیں۔ اس ادارے کا رہا سہا بھرم خلیجی جنگ کے دوران اقوام متحدہ کے غلامانہ کردار نے کھو دیا۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری جس طرح بش کے صادر کردہ احکامات کی تعمیل کروانے کے لیے غلام گردش میں رہے۔ اس نے اقوام متحدہ کے ادارے کا امریکی داشتہ ہونا روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا۔ کویت سے عراق کے انخلاء کی تجویز پاس کروا کر جس طرح ایک ایک دن میں عراق پر چار چار ہزار ہوائی حملے کر کے لاکھوں نہتے عوام کو ہلاک کیا اور اس کے بعد جس سرعت سے ایک درجن کے قریب قراردادیں عراق کے خلاف پاس کروا کر اس پر عمل درآمد کروایا حالانکہ مسئلہ کشمیر و فلسطین پر اسی ادارے کی قراردادیں بیسیوں سال سے سرد خانوں میں پڑی ہیں اس کے بعد بھی کسی کو اقوام متحدہ کے آزادہ ادارہ ہونے کی خوش فہمی ہے تو اسے اپنی دماغی صحت پر شبہ کرنا چاہیے۔ گفت و شنید کے ذریعہ مسائل کے حل کا تازہ نمونہ یہ ہے کہ خلیجی جنگ کے دوران امریکہ نے من جملہ اور وعدوں کے مسئلہ فلسطین کے حل کا وعدہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ۱۵۔ اکتوبر کو مشرق وسطیٰ میں امن کے نام پر واشنگٹن میں جو کانفرنس ہونے جا رہی ہے' اس سے نیو ورلڈ آرڈر کے اس نکتہ کے سمجھنے میں آسانی ہوگی' امریکی سپروائزر کی سرپرستی میں جب گفت و شنید کے لیے جمع ہوں گے' اس میں خلیجی تعاون کونسل کے ممالک محض مبصر کی حیثیت سے ہوں گے' ان کا کوئی ووٹ نہیں ہوگا۔ مصر و شام امریکی تجاویز کے سامنے اپنے موقف سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ وہ امریکی موقف کے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ سب سے دلچسپ بات یہ کہ جن کا مسئلہ ہے' انہیں اس کانفرنس میں مدعو کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ فلسطینیوں کی واحد نمائندہ تنظیم کو دعوت نہیں دی گئی بلکہ چند امریکہ کے پسندیدہ فلسطینی اردن کے وفد کے تحت ہوں گے۔ دیکھا جائے تو امریکہ

اور یورپی ممالک کے کردار کے حوالہ سے کانفرنس کا تشخص غیر جانبدارانہ نہیں بلکہ خالص صیہونی ہوگا اور اس کے نتائج وہی ہوں گے جو امریکہ کو مطلوب ہیں :

(ا) عربوں کی طرف سے اسرائیل کے بائیکاٹ کا خاتمہ

(۲) تحریک انتفاضہ کے خاتمہ کی ضمانت

(۳) تنظیم آزادی فلسطین کے کردار کا خاتمہ

(۴) علاقہ کے آبی وسائل اور تیل کی دولت کی امریکی پسند کی مساوی تقسیم

(۵) اسرائیلی شرائط پر عرب اسرائیل تعلقات

(٦) اور غیر مشروط طور پر اسرائیل کو تسلیم کرنے پر اس کا اختتام ہوگا

اب عرب ممالک خاص طور پر خلیج تعاون کونسل کے رکن ممالک کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کر لینا چند دنوں کی بات ہے۔ سعودی عرب سمیت ٦ عرب ممالک نے اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ امیر کویت اپنے آپ کو امریکہ کی خود سپردگی پر بات چیت کے لیے عنقریب واشنگٹن پہنچ رہے ہیں۔

اس نئے عالمی نظام کا ایک حصہ گریٹ اسرائیل کا قیام بھی ہے۔ خلیجی جنگ کے بعد اس منصوبہ پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ امریکہ سکڈ توڑ میزائل کی ٹیکنالوجی اسرائیل منتقل کر چکا ہے۔ ۴۰ ایف سولہ طیاروں کے علاوہ جنگ کے دوران اسلحہ کے جو انبار لگائے گئے تھے' اس کا بڑا حصہ اسرائیل منتقل ہو چکا ہے۔ اب مشرق وسطی میں ایک طرف اسرائیل نیو کلیر یا نیولاجیکل ہتھیاروں سے لیس' دوسری طرف مخالف کیمپ نہتا ہوگا۔ امریکہ میں تو اس بے جوڑ مقابلے کی روایت ہے۔ بدیسی سفید فام یورپی اقوام کے پاس توپ اور بندوق تھی تو ریڈ انڈین دیسیوں کے پاس تیر کمان جو توپ وبندوق کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بالآخر دیسیوں کی نسل ختم ہو گئی۔ تہذیبوں کے عروج وزوال میں اسلحہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اسی سے قومیں فاتح ہوتی ہیں اور اسی سے غلام بنتی ہیں۔۔ امریکہ کے نزدیک اب وقت آگیا ہے کہ

اسرائیل کے مقابلہ میں مسلمان ملکوں کو نہتا کر دیا جائے تا کہ پھر وہی امریکی تاریخ مشرق وسطیٰ میں دہرائی جائے جس طرح آج امریکہ میں ریڈ انڈین ڈھونڈے نہیں ملتے اسی طرح گریٹ اسرائیل (جس میں نصف درجن کے قریب عرب ممالک کے علاقے شامل ہیں) فلسطینی اور عرب ناپید کر دیے جائیں۔ اس خطے کے مسلمان ممالک کو ان کی حماقتوں' زمانہ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے اور ان کے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات کی صورت میں ملنے والی ہے۔ قدرت کی دی ہوئی بے پناہ دولت کو انہوں نے جس بے قدری سے اپنے عیش و آرام پر لٹایا اور اپنے دفاع سے جس قدر اغماض برتا' اس کا نتیجہ بھی انہیں بھگتنا پڑے گا۔

خلیجی جنگ بھی نیو ورلڈ آرڈر کا ایک حصہ تھی جس سے عربوں کو ڈھیر بھی کیا اور زیر بار احسان بھی۔ اربوں ڈالر کا معاوضہ بھی وصول ہوا۔ اب امریکہ کا تیل پر بھی دعویٰ ہے اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی وفاداری پر بھی۔ اب کئی عشروں تک عرب امریکہ سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ کویت کی تعمیر نو میں ۷۰ فیصد سے زیادہ ٹھیکے حاصل کرنے کے علاوہ امریکی خلیجی تعاون بینک کے ذریعہ عرب شیوخ کی ساری دولت کا امریکہ میں سمٹ آنا فری مارکیٹ اکانومی کا ادنیٰ کرشمہ ہوگا۔ ہمارے عرب دوستوں نے امریکہ کے صدر بش کا اقبال اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ اپنے ملک کو دنیا میں سپریم طاقت منوانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب صدر بش ان کی انتظامیہ یا کانگریس سے یہ توقع رکھنا یا اس خوش فہمی میں مبتلا ہونا کہ کسی بھی مسلم ملک کو دفاعی طاقت کے اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل رہنے دے گی' شتر مرغ کی طرح آنکھیں موند کر ریت میں سر دینے کے مترادف ہے۔

امریکہ کے اس نئے نظام کا دائرہ فی الحقیقت پوری دنیا میں امریکی بالادستی' مفادات کا تحفظ اور اس کے دائرۂ اثر میں توسیع پر مبنی ہے۔ یہ نیا عالمی نظام معیشت' صنعت' تجارت' دفاع' ثقافت اور تہذیب وتمدن تک کو اپنے دائرہ اثر میں لیے ہوئے ہے اور اس کے پس منظر میں در اصل عالمی صیہونی ریاست کے

قیام کا مقصد کارفرما ہے۔ صیہونی دماغ فی الوقت اپنے مقاصد کے لیے امریکہ کو استعمال کر رہا ہے کیونکہ اس مرحلہ پر امریکی مفادات کا تحفظ ہی در اصل صیہونی مفادات کا تحفظ ہے۔ یہ بندوق امریکہ کے کندھے پر رکھ کر چلائی جا رہی ہے۔ غرض یہ بش صاحب کا نیا عالمی نظام دنیا پر صیہونی اقتدار کا صدیوں پرانا خواب ہے اور اس امریکی نظام میں مسلم دنیا اپنا مستقبل تلاش کرنے کی کوشش کرے تو وہ ہے یہود ونصاریٰ کی غیر مشروط غلامی' خواہ امریکی فلاسفر اسے کتنے ہی خوشنما الفاظ میں چھپانے کی کوشش کریں۔

مغربی میڈیا اور عالم اسلام

روس کی شکست وریخت کے بعد مغرب سمجھ رہا ہے کہ اب دنیا میں مغرب کی بالادستی کی راہ میں واحد رکاوٹ اسلام ہے۔ اسے اس بات کا بھی خوف ہے کہ اگر دنیا کے کسی خطے میں اسلام اپنی صحیح ہیئت کے ساتھ نافذ ہو گیا تو کمیونزم کی طرح مغربی نظام حیات (ویسٹرن سولائزیشن) بھی ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جائے گا۔ اس خوف سے مغرب دنیا کی اسلام دشمن طاقتوں کو ساتھ ملا کر اسلام کے مقابلہ پر صف آرا ہو گیا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام پر کاری ضرب لگانے یا اسے ختم کرنے کا تاریخ میں ایسا سنہری موقع اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ آج کے دور میں اسلام پر مغرب کا یہ حملہ ایک نئے رخ سے ہے جسے ہم میڈیا وار کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ اس کی طاقت ایٹم بم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ میڈیا لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ذہن ودماغ کو جس طرف چاہے موڑ دیتا ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ مغرب محض موثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعہ ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ وہ میڈیا کے ذریعہ ہماری سوچ کو متاثر کرتا ہے اور منصوبے کے تحت اسے خاص رخ پر ڈالتا ہے۔ یہ دور جسمانی غلامی کا نہیں' ذہنی غلامی کا ہے۔ ماضی میں جب ضعیف قوموں کو غلام بنایا جاتا تھا' تجارتی مقاصد کے لیے کمزور ملکوں کو نو آبادی اور کالونی بنایا جاتا تھا۔ اس وقت مغرب نے ایشیائی وافریقی عوام کو غلام بنا لیا تھا۔ اس دور میں آپ کو کہیں انسانی حقوق کا ذکر نہیں ملے گا کیونکہ انسانی حقوق کا فلسفہ مغربی استعمار کے مفادات کی نفی کرتا تھا۔ جب مغرب کی استعماری قوتوں کو آزادی کی تحریکات کے آگے ہتھیار ڈال کر غلام ممالک سے رخصت ہونا پڑا تو اس کے ساتھ ہی انہیں ڈیمو کریسی وجمہوریت اور

انسانی حقوق کا خیال آ گیا تا کہ اس راہ سے بھی کمزور اقوام کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع مل سکے۔ اب مغرب نئی تیاریوں اور نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آیا ہے۔ وہ جسم کے بجائے انسانی ذہنوں کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ ذہنی غلامی' جسمانی غلامی سے کہیں زیادہ بد تر اور خوفناک ہوتی ہے اور اس دور میں ذہن و فکر کو غلام بنانے کا سب سے موثر ذریعہ میڈیا ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی میڈیا کی یلغار ہے۔ ادھر چند سالوں سے ہماری کمزوری بے حسی اور غفلت کے سبب میڈیا کے راستے سے بھارت کی دیو مالائی تہذیب بھی حملہ آور ہو گئی ہے۔ شرک وبت پرستی جس کے تصور سے بھی ایک مسلمان کو کانپ جانا چاہیئے تھا' اللہ کے آخری پیغمبر کا ارشاد ہے "اے ابو ذر' تیرے نزدیک شرک تیرے زندہ جلائے جانے اور جسم کے ٹکڑے کر دیے جانے سے زیادہ اشد اور خوفناک چیز ہو" اب ریڈیو' فلموں' ٹی وی پروگراموں اور سیٹ لائٹ کے ذریعہ ہماری نئی نسلوں کے ذہن سے شرک وبت پرستی کی شناعت اور نفرت کھرچ کھرچ کر ختم کی جا رہی ہے۔ یہی نہیں' مرزائی وقادیانی اسلام کے لبادے میں نئی نبوت کی دعوت اور ارتداد کی مہم پر سرگرم عمل ہو چکے ہیں۔ ہمیں نہ صرف میڈیا کے اس بے رحم حملے کو روکنا ہے بلکہ میڈیا کا متبادل فراہم کرنا بھی وقت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جس پر بحیثیت مسلمان ہمارے وجود وبقا کا دار ومدار ہے۔ اگر اب بھی ہم نے غفلت برتی تو تاریخ اور آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

اسلام کو ہر دور میں بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا رہا ہی مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلام پر چودہ سو سالہ دور میں اتنا نازک وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ بلاشبہ تاتاریوں کا حملہ ایک بہت بڑا حملہ تھا مگر اس کی نوعیت محض عسکری تھی اور چند ہی سالوں میں اسلامی تہذیب وعلوم نے تاتاریوں کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ اسی طرح اس صدی کے شروع میں کمیونزم کا حملہ ایک طاقتور فکری حملہ تھا۔ مگر اس کی نوعیت اصلاً" اقتصادی تھی۔ یہ مغرب کے بے لگام سرمایہ دارانہ نظام کا رد عمل تھا

مگر آج مغرب کا فکری حملہ تاریخ کا سب سے بڑا حملہ ہے جو ہمہ جہتی ہے۔ یہ حملہ فکری بھی ہے اور علمی بھی' اقتصادی اور معاشی بھی ہے' تمدنی و تہذیبی بھی۔ یہ سیاسی بھی ہے اور عسکری بھی اور دنیا کے چپہ چپہ کو محیط ہے۔ روئے زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو اس کی یلغار اور دسترس سے محفوظ ہو۔ اسلامی تاریخ میں مغرب کے اس فکری حملے کی مماثلت کسی حد تک دوسری صدی ہجری میں یونانی علوم و فلسفے کی یلغار سے دی جا سکتی ہے۔ جب اسلام دنیا میں تیزی سے پھیل رہا تھا یونانی علوم وفنون' فکر وفلسفہ کو اسلام کی تیز رفتار ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ان علوم کو ذہن و فکر کو الجھانے اور دلوں میں ایمان و ایقان کی جگہ تذبذب و شکوک کے کانٹے بونے کی لیے استعمال کیا گیا تا کہ اسلام پر سے اعتماد کو متزلزل کر دیا جائے لیکن اس دور کا مسلمان علم میں آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا اور مسلم علماء مفکرین کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا۔ انہوں نے وقت کے چیلنج کو قبول کیا اور یونانی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ان افکار و نظریات و فلسفوں کا تنقیدی جائزہ لیا' ان سے غیر اسلامی اجزا کو خارج کر کے ان علوم وفنون کو اسلام کا معاون ومددگار بنا دیا حتیٰ کہ آج یہ اسلامی علوم وفنون سمجھے جا رہے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے کہ انہوں نے یونانی فلسفہ و فکر کو مسلمان بنایا۔ اگر گزشتہ چند صدیوں سے مسلمان پسماندہ نہ رہ گئے ہوتے اور علماء کا علم وسائنس کے دور سے رشتہ نہ کٹ گیا ہوتا تو مغربی افکار و نظریات کا دقت نظر سے تنقیدی جائزہ لیتے' ان سے فاسد اور مضر اجزاء کو علیحدہ کر کے انہیں اسلام کا معاون بنا لیتے۔

اس کائنات میں انسانوں کی حقیقی تقسیم صرف ایک ہے اور وہ ایمان وکفر کی تقسیم ہے۔ ہر انسان مومن ہے یا کافر ہے۔ خالق کائنات کے نزدیک بھی' قرآن کے نزدیک بھی' تمام سماوی کتابوں کی رو سے بھی۔ آج بھی اور قیامت تک یہی سب سی بڑی اور قابل لحاظ تقسیم رہے گی۔ اس کے علاوہ دنیا میں انسانوں کی اور جتنی تقسیمیں ہیں' خواہ ملکی اور علاقائی بنیاد پر ہوں' قومی ونسلی بنیاد پر ہوں یا

لسانی بنیاد پر، یہ سب غیر حقیقی اور انسانوں کی خود ساختہ ہیں یا اس درجہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ جس طرح اسلام کا مقصد دنیا سے شرک و کفر کو مٹانا ہے، اسی طرح دنیائے کفر کا اولین مقصد اسلام اور مسلمان کو ختم کرنا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں یہود کی ذہانت وذکاوت اور مغرب کے وسائل اور طاقت اور برہمن کی مکاری و عیاری اسلام دشمنی میں متحد ہو چکی ہیں۔ یہ حقیقت ہے جس سے آج ہم سے بہت سے حضرات آنکھیں چراتے ہیں اور خود فریبی میں رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن حالات وواقعات اور قدرت کے تازیانے باربار اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ایک بات کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کا مجھے گزشتہ چند دنوں میں کئی بار تجربہ ہوا۔ ہمارے بہت سے قابل احترام صحافی دوست ہر حالت میں غیر جانبداری کو اپنا طرہ امتیاز سمجھتے ہیں۔ یقیناً غیر جانبداری بہت بڑی خوبی ہے۔ قرآن مجید کی بھی تعلیم ہے "کسی فرد یا قوم کی دشمنی وعصبیت تمہیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے" لیکن جہاں مسئلہ صحیح اور غلط کا ہو، حق وباطل کا ہو، ظالم ومظلوم کا ہو، وہاں غیر جانبداری سراسر ظلم ہے۔ وہاں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان غیر جانبدار نہیں بلکہ حق وصداقت کا طرفدار رہے۔ میں سمجھتا ہوں اس طرح کی اندھی غیر جانبداری مغربی فکر وتعلیم کی دین ہے اور شاید اس کی ایک چال بھی کہ حق وباطل کے درمیان فرق و امتیاز کو ختم کرکے مسلمان کو غافل کر دیا جائے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ مغرب غیر جانبداری کا ڈھونگ رچا کر ہر جگہ اسلام کی خلاف ڈنڈی مار دیتا ہے۔ جب اور جہاں اسلام کا مسئلہ آیا، مغرب کی جانبداری عیاں ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال پاکستان کے کمیشن برائے انسانی حقوق کی وہ رپورٹ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "پاکستان میں خواتین کے ساتھ ہونی والی زیادتیوں کے بڑھنے کی وجہ اسلامی بنیاد پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے" اسے مغربی میڈیا نے خوب اچھالا ہے۔ آپ ذرا اس جملے کا تجزیہ کیجئے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے رجحان کا کیا مطلب ہے؟" انسان کا مذہبی ہونا شریعت کا پابند ہونا۔ جس شخص کو آخرت اور یوم الحساب کا خوف ہو وہ ایسے فعل کا تصور بھی

نہیں کر سکتا کجا یہ کہ دینداری کو وجہ اور سبب قرار دیا جائے۔ خواتین کے ساتھ زیادتی کے بڑھنے والے واقعات کا میڈیا کا یہ ایک جملہ کتنا خوفناک ہے۔ اس میں اسلام کا کیا تصور ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے؟ میڈیا نے ایک چھوٹے سے جملے سے اسلام کے خلاف کس قدر زہر ذہن میں بھرنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں دو فکروں کا تصادم برپا ہے۔ ایک اسلامی فکر دوسری مغربی فکر۔ مغربی فکر کا خلاصہ دو لفظوں میں دین و سیاست کی علیحدگی سے کیا جاسکتا ہے۔ مغرب کے نزدیک مذہب خالصتاً" ایک نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے' اس کے نزدیک مذہب کی حدود عقائد وعبادات پر ختم ہو جاتی ہیں' اسے کسی اجتماعی مسئلہ میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے جبکہ اسلام اس تفریق کا قائل نہیں ہے۔ وہ انسان کی ہر انفرادی واجتماعی مسئلے میں رہنمائی کرتا ہے۔ فرد' معاشرہ' سیاست' معیشت' نظام حکومت' بین الاقوامی تعلقات تک کے احکام وفرائض دیتا ہے اور ضابطے مقرر کرتا ہے۔ وہ انفرادی واجتماعی کسی مسئلے میں انسان کو بے لگام نہیں چھوڑتا۔ مغرب "گاڈ" (GOD) کو مسیح کو اور بائبل مانتا تو ہے مگر صرف اس حد تک کہ مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا ہی نجات کے لیے کافی ہے۔ باقی وہ مسیح کو' ان کی لائی ہوئی شریعت وکتاب کو حتیٰ کہ مسیح کے باپ کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اجتماعی مسائل سیاست' معیشت واقتصادیات' معاشرت' نظم ونسق وقانون میں دخل اندازی کرے۔ مغرب کے اس فکر وفلسفے کی جڑیں یورپ کی گزشتہ چار سو سالہ تاریخ میں پیوستہ ہیں۔ یورپ کے عوام ہزارہا سال سے بادشاہت ومذہبی پادریوں کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ سولھویں صدی عیسوی میں جب یہاں علم وسائنس اور ٹیکنالوجی کا دور شروع ہوا اور یورپ کا انسان بیدار ہونے لگا' اس نے قدرت کے مخفی خزانوں کا انکشاف اور اس کی تسخیر شروع کی' اس وقت یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے اپنی عاقبت نا اندیشی سے علم وسائنس سے انکار کی راہ اختیار کی۔ یورپ کے اس دور کی مذہب وسائنس کی کشمکش کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے احتساب کی عدالتیں قائم کر کے ہزارہا انسانوں کو ان

کے علمی نظریات کی بنیاد پر جیسے زمین کا گول ہونا' حرکت کرنا یا اس میں کشش کا ہونا' اذیت ناک سزائیں دیں اور انہیں زندہ جلایا' سولی چڑھایا۔ پادریوں کے اس علم دشمن رول کی وجہ سے یہاں کے عوام کے دلوں میں مذہب کے خلاف ایک طرح کا عناد جڑ پکڑ گیا کہ مذہب علم وسائنس کا' دنیاوی ترقی وبہبود کا دشمن ہے۔ میں مذہب کے خلاف اس بدگمانی میں یورپ کی اقوام کو بڑی حد تک معذور سمجھتا ہوں۔ توقع تھی کہ آہستہ آہستہ یہ زخم بھر جائے گا اور نفس مذہب کے خلاف جو نفرت وعناد پیدا ہو گیا ہے' وہ وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گا لیکن اس دوران یہاں ایک اور شاطر وعیار طبقہ سامنے آ گیا جس نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر مذہب دشمنی کی چنگاری کو ہوا دینی شروع کی تا کہ مذہب دشمنی کی آگ پر اپنے مفادات کی روٹیاں سینک سکے اور خداوند مذہب کی جگہ اپنا اقتدار قائم کر سکے۔ یہ طبقہ تھا نسل پرست صیہونیت اور یہاں کے اشرافیہ کا۔

یہ انسان کی بدنصیبی تھی کہ گزشتہ صدیوں میں دنیا کے بیشتر حصہ پر اور عالم اسلام پر یورپ کی حکمرانی رہی۔ اس نے تعلیم' ابلاغ اور تمام وسائل بروئے کار لا کر اس مغربی فکر کو ذہنوں میں اس طرح راسخ کر دیا کہ مسلم دنیا کا کوئی طبقہ اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا حتیٰ کہ علماء کا طبقہ جن کا استعمار دشمنی اور اخلاص وطن کی راہ میں جہاد وقربانی کا نہایت شاندار اور عظیم ریکارڈ ہے' وہ بھی غیر شعوری طور پر اس فکر کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دینی مدارس وجامعات میں فقہ وحدیث کے درس میں استاد کا پورا زور بیان اور تحقیق عقائد وعبادات پر رہتا ہے۔ کتاب الطہارت سے کتاب الحج تک' زیادہ زور مارا تو کتاب النکاح و کتاب الطلاق۔ حالانکہ احادیث وفقہ کی انہی کتابوں میں کتاب البیوع بھی ہے' کتاب الاجارہ' کتاب الامارہ بھی' کتاب المزارعہ بھی اور قضا' سیاست اور مملکت کے متعلق دیگر ابواب بھی مگر ہم ان سے اس طرح گزر جاتے ہیں گویا یہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں علماء نے جس دشمن کے خلاف جہاد شروع کیا تھا' ان کے بعد والوں نے اسی فکر کو گلے لگا لیا۔ ایک عزیز نومسلم دوست کا تجزیہ مجھے بہت پسند

آیا۔ گزشتہ دنوں ایک ملاقات میں انہوں نے کہا برصغیر میں ۱۸۵۷ء میں مسلم حکمرانوں اور علما نے انگریز سے جو شکست کھائی' اس وقت علما نے محسوس کر لیا تھا کہ عسکری میدان میں انگریز کی قوت کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر مزید میدان میں ٹھہرے تو انگریز کچل کر ختم کر دے گا۔ انہوں نے وقت کی حکمت عملی کے تحت دیوبند' گنگوہ جیسے چھوٹے قصبات میں دینی مراکز قائم کیے تا کہ جتنا دین بچایا جاسکے' بچا لیا جائے۔ چنانچہ وہ دینی علوم وفنون' اسلامی معاشرت وتمدن اور ایک مسلمان کا خدا ومذہب سے تعلق باقی رکھنے کی جد وجہد میں لگ گئے۔ اگرچہ ان کے پیش نظر افراد سازی اور بھرپور تیاری کر کے دوبارہ میدان میں آنا تھا۔ مگر بعد کے حالات نے انہیں فرصت نہیں دی۔ ان علما کے میدان چھوڑنے سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستان دوسرا اسپین بننے سے بچ گیا' وہیں سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ علما کا طبقہ زمانے سے کٹ گیا۔ علم وفکر کا قافلہ ۱۸۵۷ء میں جہاں تھا' یہ اب تک اسی بارڈر پر ہے۔ اس ڈیڑھ صدی میں علم وسائنس اور صنعت و ٹیکنالوجی نے جو بے مثال ترقی کی ہے' یہ اس سے بے بہرہ ہو گئے جس کی وجہ سے زمانے کو سمجھنے کی بصیرت اور شعور گھٹتا چلا گیا لیکن ہمیں اعتراف کرنا چاہیے' آج جتنا دین علم ودین باقی ہے حتیٰ کہ یہاں مغرب میں بھی مساجد ومدارس کا جال پھیلا ہوا ہے' یہ سب انہی حضرات کی سعی وکاوشوں کا ثمر ہے۔

آج دنیا میں تصادم دو فکروں کا ہے اور بظاہر مغربی فکر ہر طرح حاوی اور غالب توانا وطاقتور ہے لیکن اہل بصیرت سے مخفی نہیں کہ مغربی فکر وتہذیب اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہے۔ عرصہ سے اس کا کھوکھلا پن نمایاں ہو چکا ہے۔ اس کے اندر انسانیت کو مزید کچھ دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال "یہ تہذیب اپنے ہی خنجر سے خود کشی کرنے پر تلی ہوئی ہے" یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مفکرین اور دانشور ہی نہیں' آپ کا پرائم منسٹر بھی بنیادوں کی طرف واپسی کی مہم چلانے پر مجبور ہے۔ کہاں تو اسلام کے خلاف بنیاد پرستی کی گالی وضع کی تھی اور کہاں بنیادوں کی طرف واپسی کی مہم چل پڑی۔ علامہ اقبال نے یورپ

کے آخری سفر سے واپس جاتے ہوئے فلسطین کے خطاب میں ایک فکر انگیز بات فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا "پوری انسانیت کی آخری پناہ گاہ بالاخر اسلام ہی ثابت ہوگا۔ یہ بات مغرب جتنی جلدی سمجھ لے' اس کے لیے بہتر ہے اور مشرق کے لیے بھی" ایک جگہ علامہ نے لکھا ہے کہ "میں نے تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ جب کوئی نازک وقت آیا تو اسلام نے آگے بڑھ کر مسلمان کی حفاظت کی۔ مسلمان نے کبھی اسلام کی حفاظت نہیں کی۔" علامہ اقبال کہا کرتے تھے اس دور کا مجدد کہلانے کا وہی شخص مستحق ہوگا جو اسلامی شریعت کی برتری ثابت کرے اور زندگی سے اس کا پیوند لگائے اور ثابت کرے کہ اسلامی قانون وضعی قانون اور انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین سے آگے کی چیز ہے۔ زمانہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دنیا نے خواہ کتنی ہی ترقی کی ہو لیکن اسلامی قوانین اس کی رہنمائی کی اب بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے تمام سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل ان کے اندر موجود ہے۔ ان میں ایک بالغ اور ترقی یافتہ زمانے اور معاشرے کی تنظیم کی بہترین صلاحیت ہے۔

اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ اور سب سے بڑا بحران یہ ہے کہ مغربی فکر و تعلیم نے اسلام پر سے جدید طبقے کے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ انسان کہتا ہے کہ اسلام نے ایک زمانے میں بیشک اچھا کام کیا تھا' اچھا پارٹ ادا کیا تھا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اس وقت زمانہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ تھا۔ اب ماڈرن ہو چکا ہے۔ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ اب اسلام اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ ہے وقت کا اہم مسئلہ۔ اب یہ ثابت کرنا کہ اسلام اس تنزل کے بعد بھی زمانے کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے' اسلام اس دور کو راہ پر لگا سکتا ہے' اسلام اس زمانے کو رہنے کا سلیقہ سکھا سکتا ہے' تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام پر اعتماد واپس لاتا ہے۔ اسلام کی ابدیت پر' اس کی افادیت پر' اس کی صلاحیت پر یقین بحال کرنا ہے۔ میرا ۲۰ سالہ تجربہ ہے ہم لوگ مکتب و مدرسہ میں ۶' ۷ سالہ بچے کو اسلام پڑھاتے ہیں۔

جب بچہ ۱۳' ۱۴ سال کی عمر میں مکتب سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو یہاں کا میڈیا اس کے ذہن کو اس طرح شکار کرتا ہے اور اس پر قبضہ کرتا ہے کہ چند سال میں جو کچھ اس نے مسجد و مدرسہ میں پڑھا ہوتا ہے' اس کا بڑا حصہ بھول چکا ہوتا ہے اور اس پر یہاں کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ ہماری مثال اس بڑھیا کی سی ہے جو صبح سے شام تک چرخا کاتتی ہے اور شام کو اسے الٹا گھما کر خود برباد کر دیتی ہے۔ اس طرح ہماری ساری دینی تعلیمی کوششوں پر یہاں کا میڈیا پانی پھیر دیتا ہے۔ ہم بچے کے ذہن و دماغ میں اسلام کی بنیاد تعمیر کرتے ہیں اور میڈیا اسے مسمار کر دیتا ہے۔

مغرب کے میڈیا کا اسلام کے خلاف ایک موثر ہتھیار انسانی حقوق کا مسئلہ ہے جسے مغربی میڈیا نہایت عیاری سے اسلام کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ نصف صدی پہلے تک جن لوگوں کے نزدیک کروڑوں انسانوں کی حیثیت حیوانوں سے زیادہ نہیں تھی' وہ اچانک انسانی حقوق کے ٹھیکیدار بن گئے گویا پرانے شکاری نیا جال لے کر آئے ہیں۔ انسانی حقوق کی تعریف کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ وہ کہاں پامال ہو رہے ہیں؟ اس کا فیصلہ بھی امریکہ اور مغرب کرے گا تا کہ اس حوالے سے بھی مغرب کو کمزور ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا موقع مل سکے۔

آپ فلسطین سے فلپائن تک' بوسنیا سے کشمیر تک مغرب کے انسانی حقوق کی حقیقت کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آج کل مصر اور الجزائر میں ہزاروں بے قصور انسانوں کو جس بے رحمی سے قتل کیا جا رہا ہے' اس پر مغربی میڈیا کی مجرمانہ خاموشی بہت کچھ بتا رہی ہے۔ مغرب کے انسانی حقوق کی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ پاکستان کے ممتاز دانشور جناب ڈاکٹر صفدر محمود نے روزنامہ ”جنگ“ میں اپنا ایک دلچسپ واقعہ لکھا تھا۔ انہیں جون ۱۹۹۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے سان فرانسسکو جانا پڑا۔ اس سیمنار میں ایشیائی ممالک کے اسکالرز کے علاوہ مختلف امریکی یونیورسٹیوں سے بھی ممتاز پروفیسر صاحبان بلائے گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”میں نے سیمینار کے آغاز سے ایک روز پہلے ٹی وی آن کیا تو ایک دلچسپ خبر مع تبصرہ سننے کو ملی۔ کیلیفورنیا کی ریاست میں لکڑی

کی کٹائی کا عمل جاری رہتا ہے۔ خبر یہ تھی کہ کٹائی کے دوران ماہرین جنگلات کو اچانک پتہ چلا کہ اس جنگل میں ایک الو صاحب نے اپنا ایک مستقل گھر بنا رکھا ہے اور جب سے درختوں کی کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے' الو صاحب اداس رہنے لگے ہیں۔ الو کی اداسی کی خبر سے اس علاقے میں احتجاج ہوا اور کیلیفورنیا کی حکومت نے کٹائی روک دی جس سے لکڑی کی قیمت میں اضافہ ہوگیا اور مکانوں کی تعمیر قدرے مہنگی ہو گئی۔" اگلے سیمینار کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے ممتاز امریکی پروفیسر صاحبان سے اس خبر کا تذکرہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس سے آگاہ تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے گلاب کی طرح کھل گئے۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے یہ سوال داغ دیا کہ آپ نے ایک پرندے کی اداسی کی خاطر جنگل کی کٹائی روک کر لکڑی کی قیمت میں اضافہ برداشت کر لیا' لیکن چار ماہ قبل عراق کے بے قصور اور معصوم شہریوں پر بموں کی بارش کی جا رہی تھی' اس پر یہاں کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ کیا آپ کو ایک جانور ہزاروں مسلمانوں کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے؟ وہ لکھتے ہیں "میرے سوال سے ان کے چہروں کے رنگ اڑ گئے" اس ایک واقعہ سے مغرب کے انسانی حقوق کی حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس دور کا سب سے بڑا چیلنج میڈیا ہے اور یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ میڈیا کا موثر ترین اور طاقتور ہتھیار ان لوگوں کے پاس ہے جن کے پاس نہ انسانیت کے غم میں تڑپنے والا دل ہے اور نہ اس کی بد نصیبی پر آنسو بہانے والی آنکھ نہ انسانیت کی بہبودی و تعمیر کا کوئی پروگرام۔ میڈیا کی یہ طاقت تعمیر کے بجائے تخریب کے لیے' کردار واخلاق سنوارنے کی بجائے بے حیائی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کے لیے' انسانوں کی رہنمائی کے بجائے انہیں راہ سے بھٹکانے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔

اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگ جو خیر امت ہونے کے دعویدار ہیں' جو انسانیت کے سب سے بڑے محسن اور بہی خواہ کی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کے سارے انسان اللہ کی فیملی ہے اور خدا کے نزدیک وہ بہتر ہے جو انہیں نفع

اور فائدہ پہنچانے والا ہے اور جو انسانیت کی تباہی و بربادی کا غم رکھتے ہیں' آگے بڑھیں۔ ہمارے اسلاف نے دوسری صدی ہجری میں یونانی فکر وفلسفہ کا چیلنج قبول کر کے اسے اسلام کا معاون بنا لیا تھا۔ ان کے نقش قدم پر آج کا چیلنج قبول کریں۔ اس میڈیا کو مسلمان بنائیں۔ اس صحافت کو' ریڈیو' ٹی وی اور سیٹلائٹ کو مشرف باسلام کریں۔ انہیں انسانیت کی تعمیر وبھلائی کے لیے استعمال کریں۔ علوم کی اشاعت' اخلاق کی تعلیم' کردار سازی اور بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کے لیے استعمال کریں۔ الحمد للہ یہاں میڈیا کے مختلف شعبوں کے ماہرین اور ذمہ دار موجود ہیں۔ وہ اس چیلنج کو قبول کریں۔ یہ کام صرف علما یا کسی خاص طبقہ کا نہیں بلکہ ہر مسلمان کا ہے۔ یہ اس ملت بیضا کی خصوصیت رہی ہے کہ جب اسلام نے پکارا تو مسلمانوں کے تمام طبقات نے دل وجان کی بازی لگا دی۔ مغربی فکر ومیڈیا کا جواب اسی یورپ کی سرزمین پر دینا ہے۔

ایک بات واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ مغرب کے ۹۵ فیصد عوام کی اسلام سے کوئی لڑائی نہیں۔ یہ غریب خود منزل کی تلاش میں سرگرداں اور ایک مخصوص طبقے کے ستم کا شکار ہیں۔ یہ محبت وشفقت اور رحم کے مستحق ہیں بلکہ درحقیقت ہمارے لیے خام مال یعنی RAW میٹریل ہیں۔ انہی میں سے آج کے عکرمہ بن ابی جہل' خالد بن ولید پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ہزارہا اسلام کے علمبردار بن سکتے ہیں۔

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

مغربی میڈیا کا متبادل فراہم کرنا مسلم دنیا کی ۵۰ سے زائد حکومتوں کی دینی' قومی اور اخلاقی ذمہ داری تھی مگر یہ حکومتیں اب تک کوئی خبر رساں ایجنسی تک قائم نہ کر سکیں۔ مغرب نے ہر جگہ اپنے آلہ کار مسلط کر رکھے ہیں۔

یوں تو ۲۰ سال سے مسلم ممالک کی تنظیم او آئی سی کے ایجنڈے پر میڈیا سرفہرست ہے اور جدہ میں برسہا برس سے اس کے لیے ایک عالیشان عمارت میں دفتر بھی قائم ہے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کا مقصد عالم اسلام کے لیے خبر

رساں ایجنسی و سیٹلائٹ کا قیام نہیں بلکہ مسلم دنیا میں اگر کوئی کام ہو رہا ہو تو اسے روکنا ہے۔ مسلم دنیا کے حکمراں ہی نہیں' ان کے زیر اثر دینی تنظیموں تک کے لیے اسلام سے زیادہ مغرب کا وفادار و بہی خواہ ہونا ضروری ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی قابل ہو' جب تک "پرو امریکی" نہ ہو وہ رابطہ عالم اسلامی کا ممبر بن نہیں سکتا۔ اگر وہ دل سے اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھتا ہے تو ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی طرح علیحدہ کر دیا جائے گا۔

روحانیت۔ مغرب کا سب سے بڑا بحران

انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک جسم' دوسرے روح۔ انسان کے خالق نے اس کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس کائنات میں جمادات' نباتات' حیوانات کی قبیل سے بے شمار چیزیں پیدا کیں اور انسان کے اندر بھوک' پیاس' شہوت' سردی' گرمی کا احساس رکھا جو اسے جسمانی ضرورتوں کے لیے کائنات کی مادی اشیاء سے استفادہ کے لیے متحرک کرتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے خالق نے روح کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے انسان کے اندر اس کے وجدان اور تحت الشعور میں جسمانی بھوک وپیاس کی طرح ایک روحانی بھوک وپیاس اور احساس رکھا اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وحی اور انبیاء کا سلسلہ شروع کیا۔

اس کائنات میں جب سے انسان کا وجود ہوا ہے' ہر دور میں اور ہر قطعہ ارض میں بسنے والا انسان کسی نہ کسی طور پر اپنے جسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندرونی احساس وپیاس کے سبب روح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس کی طرف متوجہ رہا ہے۔ اندرون کی بے قراری' تشنگی دنیا میں مذہب کے وجود کا حقیقی سبب بنی ہے۔ آج کے ماڈرن اور خدا فراموشی ومذہب بے زاری کے دور میں بھی جو لوگ خدا ومذہب کے منکر ہیں' انہوں نے خواہ کسی اللہ (گاڈ)' اوتار' مسیح' پیغامبر کو نہ مانا ہو اور کسی آسمانی کتاب' ہدایت نامہ کو تسلیم نہ کیا ہو مگر اس کی جگہ کسی لیڈر کی حاکمیت مطلقہ اور کسی نظریہ وآئین کے تقدس اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے وہ اپنے آپ کو نہیں روک سکے۔ جس طرح ماضی قریب میں کارل مارکس' لینن' اسٹالن کو پیغمبروں کی طرح واجب

الاطاعت اور باعظمت تسلیم کر کے ان کے احکامات کے آگے بے چوں وچراں سر جھکایا گیا اور کمیونزم کی نظریاتی جنگ لڑی گئی' اس لیے کہ کسی برتر ہستی کو تسلیم کرنا' اس کی عظمت وکبریائی کے گن گانا' اس کے آگے اپنے سر نیاز کو عقیدت سے خم کرنا اور اس کی تقدیس وعظمت کو دل میں بسانا انسان کی ضرورت اور اس کے اندرون کی ایسی پیاس وتقاضا ہے جس سے کسی صورت مفر نہیں۔ اگر انسان اپنے حقیقی خالق کی عظمت وبرتری کو تسلیم نہیں بھی کرتا تو اس جذبہ کا اظہار مظاہر قدرت یا کسی لیڈر' کسی نظریہ یا کم از کم سائنسی وعلمی طور پر کائنات میں کسی غیر مرئی قوت کی ذہنی پرستش کی صورت میں کرتا ہے۔ وہ اس کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انسان کے علم النفس اور انسانی تاریخ کا مطالعہ رکھنے والا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

انسان کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کبھی انسان نے اپنے اندرون کی ضرورت یعنی روح اور اس کے تقاضوں سے صرف نظر کر کے محض مادیت' جسمانی تقاضوں پر اپنے تمدن اور معاشرے کو استوار کرنا چاہا' وہ تمدن ومعاشرہ بہت جلد تباہی وبربادی کا شکار ہو کر ختم ہو گیا یا پھر اسے روح کے تقاضوں کی طرف لوٹنا پڑا۔ جس طرح جسمانی امراض سے تحفظ اور بچاؤ کا اصل سبب انسان کے جسم میں ایک خاص قوت (قوت مدافعت) ہے' ڈاکٹر اور دوا کا کام محض اس قوت مدافعت کو تقویت پہنچانا ہے (جب کسی انسان کے جسم میں یہ قوت مدافعت باقی نہ رہے تو دنیا کے تمام ڈاکٹر اور دوائیں جواب دے جاتے ہیں اور اس کی زندگی سے ناامیدی کا اظہار کر دیا جاتا ہے) اسی طرح انسانی معاشرے کو فساد وہلاکت سے بچانے کا حقیقی سبب انسان کے اندرون کی قوت مدافعت یعنی روح کی تہذیب اور قوت ضبط ہے۔ اس کے بغیر دنیا کا کوئی قانون اور اس کے نافذ کرنے والے ادارے انسانی معاشرے کو تباہ ہونے سے نہیں روک سکتے۔ قانون اور اس کے نافذ کرنے والے ادارے محض اس حد تک ہی معاشرے کو برائیوں اور فساد سے بچا سکیں گے جب تک انسان کو ایسے مواقع دستیاب نہ ہوں کہ وہ غلط کاری کر کے بھی قانون کی گرفت

سے بچ سکے۔ اگر آج لندن، پیرس یا نیو یارک میں چند گھنٹوں کے لیے بجلی فیل ہو جائے اور یہاں کے مہذب انسانوں کو یقین ہو جائے کہ وہ قانون کی گرفت سے بچ سکتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ مغرب کا یہی مہذب انسان ایک خونخوار درندہ اور بد نما بھیڑیا بن جائے گا۔ اربوں کھربوں ڈالر کے ڈاکے، چوری، لوٹ مار، بے شمار انسانوں کا قتل اور لاکھوں خواتین کی عزت چند گھنٹوں میں لٹ جائے گی۔ غرض آج مغرب کے انسان کا مہذب وشائستہ رویہ اور قانون کی پاسداری کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ واقعتاً مہذب ہو گیا بلکہ یہ محض گناہ وغلط کاری کے مواقع نہ ملنے کے سبب سے بلکہ قانون کی گرفت میں آجانے کے اندیشے کی وجہ سے ہے۔

آج کے دور میں مغرب کا سب سے بڑا بحران یہی ہے کہ اس نے روح اور اس کے تقاضوں سے صرف نظر کر کے محض جسمانی تقاضوں (لذت وشہوات) پر اپنی تہذیب ومعاشرے کو استوار کرنا چاہا ہے۔ مغرب کا اندرونی فساد جسے ہم نے روح وباطن کا فساد کہا ہے، یہی وہ بنیادی سبب ہے جو مغربی معاشرے کو تباہی اور مکمل ہلاکت کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اس کے اندر کی دنیا اجڑ چکی ہے۔ سکون وطمانیت قلب عنقا ہو چکا ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی کے باوجود اس کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہزارہا جتن اور کوششوں کے باوجود دن بدن جرائم اور برائیوں میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ مغرب کے ہر ملک کے سرکاری اعداد وشمار سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہاں کے دانش ور، مفکرین اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہاں کے اہل نظر مغربی سولائزیشن کو تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھتا دیکھ کر چیخ اٹھے ہیں مگر انہیں اس کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔

ہمارے نزدیک مغربی سوسائٹی کی تباہی کا واحد حل ومداوا صرف روحانیت اور سچی روحانیت ہے۔ اس کے بغیر نہ انسان کی اندرونی تشنگی وبے چینی ختم ہو سکتی ہے اور نہ معاشرے کو تباہ ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ مغرب کے ایک طبقے کو روحانیت کے کھو جانے کا اتنا شدید احساس ہے اور اس کی روحانی پیاس کا یہ عالم

ہے کہ وہ روحانیت کی کسی دعوت کے سامنے آنے پر بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ وہ اتنی عجلت میں ہے کہ اس بات کی تحقیق کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کر پاتا کہ آیا وہ روحانیت جس پر وہ لبیک کہہ رہا ہے' سچی اور اصلی روحانیت ہے یا محض روحانیت کا بھروپ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزارہا یورپین نوجوان روحانیت کی تلاش میں بھارت جا کر سادھوؤں کے آشرموں میں بھٹک رہے ہیں جہاں ان بے چاروں کو روحانیت کے نام پر یوگا کی مشقیں اور ویدانت کے لایعنی فلسفے اور سفلی جذبات کو وقتی طور پر تسکین دینے والے جنس وشہوت کے مظاہرے ہی ملتے ہیں۔ چنانچہ ان میں ۹۹ فی صد مایوس ہو کر اس جعلی روحانیت کے گورکھ دھندے سے بے زار ہو کر واپس لوٹ آتے ہیں۔ دوسری طرف یہاں مغرب میں انسان کو اس کی فطری ضرورت وروحانیت کے خلا کو پر کرنے کے لیے روحانیت کے نام پر بہت سے بازی گر جلوہ گر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ کبھی روحانیت کے عنوان سے روحوں سے باتیں کرنے کا ڈراما رچایا جاتا ہے اور ابراہام لنکن' برنارڈ شا' مسٹر گاندھی' چرچل' کینیڈی کی روحوں سے بات چیت کرنے کا تماشا کیا جاتا ہے۔ کہیں اس قسم کے اور مضحکہ خیز تماشے رچائے جاتے ہیں۔ غرض بیسویں صدی میں مغرب نے روحانیت کے لفظ کو جدید معنی پہنا دیے۔ روحوں سے باتیں کرنا' مستقبل کا حال بیان کرنا اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں۔ یہ حرکتیں تو ہر دور اور ہر قوم میں جاری رہیں لیکن انہیں کبھی اتنی وقعت نہیں دی گئی' مگر انیسویں صدی میں یورپ میں روحانیت ومذہب کا جو خلا واقع ہوا ہے' اسے جعلی روحانیت سے پر کرنے کی کوشش کی گئی اور یورپ کے لوگوں کی بڑی تعداد اس گورکھ دھندے کو اصلی روحانیت اور مذہب کا ماحصل سمجھنے لگی۔ بیسویں صدی میں یہ رجحانات اس قدر پھیلے کہ ان کی وسعت وطاقت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ پھر بعض سائنس دانوں نے ماورائے ادراک (Extra Sensory Perception) پر تجربے کر کے ان حرکتوں کو سائنسی حیثیت سے بھی وقعت دے دی۔ اس طرح مغرب کی روحانیت ومذہب

سے فرار کی کوششیں بد ترین قسم کی ضعیف الاعتقادی پر منتج ہوئیں۔

چند سال قبل نوٹنگھم یونیورسٹی میں ایک پادری سے ملاقات کے دوران جب ان سے سوال کیا گیا کہ یورپ میں مذہب کو زندگی کے اجتماعی شعبوں سے بے دخل کرنے کے معاشرے پر کیا اثرات پڑے ہیں تو انہوں نے کہا کہ مذہب کو زندگی کے اجتماعی معاملات سے بے دخل کرنے کے ہماری سوسائٹی پر انتہائی بھیانک اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ہمارا معاشرتی نظام تباہ ہو گیا' ہماری تہذیبی قدریں ختم ہو گئیں' ہمارا خاندانی استحکام ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا' ہماری نئی نسل جنس اور منشیات کا شکار ہو گئی۔ زندگی کا کوئی ارفع مقصد نہیں رہا۔ ہم بے روح لاشے کی طرح اپنی سوسائٹی کا حصہ بن کر رہ گئے۔ جب ہم نے ان سے اگلا سوال کیا کہ آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا حل سچی روحانیت ہے جو ہم عرصے سے کھو چکے ہیں۔ اس کے حل کے لیے ہم آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آپ لوگوں کی آنکھوں میں روحانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس وقت مغرب کو تباہی سے صرف سچی روحانیت ہی بچا سکتی ہے۔

جس طرح رات کے گھپ اندھیرے میں ٹمٹماتا ہوا دیا بھی روشنی دیتا ہے' چھوٹے سے جگنو کی روشنی بھی محسوس کی جاتی ہے' اسی طرح مغرب کا حساس اور سلیم الطبع طبقہ روحانی خلا کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اسے روحانیت کی کچھ جھلک مسلمانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے معاشرے کو تباہی سے بچانے کے لیے فکر مند ہے۔ تعاون ودست گیری کے لیے اس کی نظریں مسلمانوں کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ اب مغرب کے دانش وروں اور مذہبی لوگوں کا معتد بہ طبقہ جو اہل مغرب کی مذہب سے دوری اور نئی نسل کی بے راہ روی پر ملول اور رنجیدہ ہے' وہ ان آفات سے نجات کے لیے امید بھری نظروں سے اسلام اور مسلمانوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی آف مشی گن کے ڈاکٹر سیلون ان امور کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوئس کنٹری (Louis Cantori) اور انٹونی سلیون (Antony T. Sullivan) کا خیال تھا کہ مغرب کے روایت پسند اور تہذیبی طور پر قدامت پسندوں کے خیالات بہت حد تک اس فکر کے موافق ہیں جسے ہم تصور احیائے اسلام کہتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ قدامت پسندی یورپ وامریکہ کے قدامت پسندوں (اہل مذہب) کو یہ راہ دکھاتی ہے کہ وہ ان نقصانات کی تلافی کے لیے اسلام کے ساتھ مل کر جدوجہد کریں جو سابقہ جدیدیت کی وجہ سے انسانیت کو اٹھانا پڑے۔ کنٹری نے ان امراض کا بطور خاص ذکر کیا جن میں جدید دور نے مشرق ومغرب کو مبتلا کر دیا ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں عقیدے' خاندان اور معاشرے کے انتشار کو بطور مثال پیش کیا۔ کنٹری اور سلیون نے آزاد ترقی کے تصور کے اس ایجنڈے کی پرزور مذمت کی جو عالم اسلام پر زبردستی مسلط کیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی قدامت اور اسلام کو مشترکہ مقاصد اور مشترکہ فرہنگ پر متفق ہونا چاہیے۔"

ایک بار بی بی سی لندن کے ڈائریکٹر جناب جان برٹ کے نومسلم صاحبزادے یحییٰ نے بڑے پتے کی بات کی۔ انہوں نے کہا' آپ مغرب سے کبھی سسٹم ونظام (سیاست) کے حوالے سے گفتگو نہ کریں' اس لیے کہ مغرب کا سسٹم ونظام بہرطور مسلم ممالک سے کہیں بہتر ہے۔ ہاں جب دنیا میں کہیں صحیح اسلامی خلافت قائم ہو جائے تو اس وقت سسٹم کے حوالے سے بات کیجئے گا۔ آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ خلا کون سا ہے جس کے ذریعے سے آپ اہل مغرب کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں اور انہیں متاثر کر سکتے ہیں۔ ایک مفکر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ قبولیت اسلام کا تعلق دل سے ہے' دماغ سے نہیں۔ دنیا میں آج تک جتنے لوگ مسلمان ہوئے' اگر ان کے اسلام لانے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا مسلمان ہونا اس بنا پر ہوا کہ دل کو اسلام کی کسی چیز نے کھینچ لیا۔ ان کے دل کو اسلام کی کوئی ادا بھا گئی۔ اسلام کا کوئی پہلو دل میں کھب گیا جس نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی شخص دماغ کی راہ سے اسلام تک پہنچا ہو یعنی عقلی دلائل

سے مغلوب ہو کر یا بحث میں لاجواب ہو کر مسلمان ہوا ہو۔

یہ ایک بین حقیقت ہے کہ دور صحابہ کے بعد دنیا میں زیادہ تر اشاعت اسلام ان پاک نفس لوگوں ہی کے ہاتھوں ہوئی جنہوں نے اپنی روحانی طاقت سے بندگان خدا کے درد کا درمان کیا اور ان کے زخمی دلوں پر غم خواری وشفقت کا مرہم رکھا جنہیں عرف عام میں صوفیاء کرام یا اولیاء کرام کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات ہمیشہ جاہ واقتدار کے چکروں سے بے نیاز' دنیا کی لذت سے دست کش' زہد وقناعت' توکل وایثار کی دولت سے مالامال رہے۔ انہوں نے کبھی وقت کے ذی اقتدار اشخاص اور سلاطین کا قرب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے آستانوں پر لوگ اپنے غموں اور تکالیف کا مداوا ڈھونڈنے آتے اور سکون قلب کی دولت پاتے۔ خود یورپ میں بڑے بڑے فلاسفر ومفکرین' چوٹی کے صاحب کمال دانشور ان ہی روحانی بزرگوں کی تصانیف سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ معروف محقق واسکالر ڈاکٹر حمید اللہ نے' جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ یورپ میں گزارا اور یورپ کے مزاج ونفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں' ایک نہایت بلیغ بات فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگیل نامی فن لینڈ کا ایک شخص سویڈن میں قیام کرتا ہے اور بظاہر کسی مسلمان سے ملے بغیر اپنے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر اسلام قبول کرتا ہے۔ فرانسیسی نژاد رینے گینوں نے اسلام ان ہی کے ہاتھ پر قبول کیا۔ گینوں کے معتقد فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں خانقاہیں چلا رہے ہیں۔ انہوں نے اسلامی تصوف کے ذریعے سیکڑوں لوگوں کو مسلمان کر لیا ہے۔ سچی بات ہے کہ جدید مغرب کے حواسوں پر کوئی فخر الدین رازی نہیں چھا سکتا' اس کے لیے کوئی محی الدین ابن عربی چاہیے۔ یہ کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے۔ اگر جاہل ہلاکو نے اسلامی دنیا کو ختم کر دیا' علوم وفنون کے مرکز بغداد کو تباہ کر دیا لیکن مٹھی بھر روحانی درویشوں نے اس کے پوتے غزل جان کو مسحور کر کے مسلمان کر لیا اور اسلامی دنیا کو فتح وبرباد کرنے والوں کو اسلام کا غلام وعلمبردار بنا لیا۔

فرانس کے معروف فلسفی ومفکر رینے گینوں (شیخ عبد الواحد یحییٰ) نے جس

سطح کے لوگوں کو مسلمان کیا اور مغرب کی فکری تاریخ پر اس کے جو اثرات پڑے' اس پر دنیا کے تقریباً" ڈیڑھ سو سے زائد ممتاز علماء واسکالرز نے تفصیلی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ موجودہ دور میں کیتھولک چرچ کے خلاف دنیا کی سب سے بڑی تحقیقی کتاب بھی گینوں کے خیالات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے والے ایک شخص (رام سوامی) ہی نے لکھی ہے۔ محققین کے نزدیک گزشتہ چھ سو سال میں گینوں سے بڑا فلسفی ومفکر پیدا نہیں ہوا۔ اس کا تحقیقی کام تقریباً" ۳۵ جلدوں میں موجود ہے۔ کاش کہ مغرب میں دعوت اسلام کا جذبہ رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مغرب کے حواس (ذہن و فکر) پر کوئی فخر الدین رازی نہیں چھا سکتا' اس کے لیے کوئی محی الدین ابن عربی چاہیے' اس کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں امام فخر الدین رازی عقل ودماغ کے نمائندے اور ابن عربی عشق ودل یعنی روحانیت وتصوف کے نمائندے ہیں۔ نیز دوسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ مغرب کے ذہن و فکر پر یونانی فلسفے نے گہرا اثر ڈالا۔ اب بھی مغرب کے ذہن و فکر پر یونانی فلسفہ کے اثرات موجود ہیں۔ شیخ ابن عربی وہ شخص ہیں جنھوں نے روحانیت وتصوف کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ اس لیے مغرب کی ذہنیت کے اعتبار سے ابن عربی کے طرز پر پیش کی جانے والی اسلام کی تعبیر ودعوت کی قبولیت کی جلد توقع کی جا سکتی ہے۔

صورت واقعہ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ مغرب کی یونیورسٹیوں میں ابن عربی پر جتنا کام ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے' شاید ہی کسی اور اسلامی شخصیت پر ہوا ہو۔ دعوت کی حکمت میں ایک داعی کے لیے مدعو کے مزاج ونفسیات کی رعایت اتنی ضرور ہوتی ہے کہ خود حق تعالیٰ نے نبیوں کو جو معجزے عطا فرمائے ہیں' ان میں زمانے کے لوگوں کے مزاج ونفسیات کی رعایت فرمائی ہے۔ جس دور میں سحر وجادو کا زور تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی مناسبت سے معجزے عطا

کیے اور جب میڈیکل وطب کا غلبہ ہوا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس اعتبار سے معجزے دیے۔ اور جب فصاحت وبلاغت کا دور آیا تو سرور کائنات ﷺ کو قرآن کریم کا معجزہ عطا فرمایا جو فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے تجزیے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمان جس راہ سے مغرب کے دلوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں' وہ روحانیت وربانیت کا پر حکمت طرز عمل ہے۔ یہ فطری بات ہے' معاشرے میں مادیت ونفس پرستی کا جس قدر غلبہ ہوگا' اسی قدر روحانیت وربانیت موثر ہوگی۔ بدقسمتی سے اس وقت اسلام کی دعوت کا سلیقہ رکھنے والے اذہان پر سیاست کا پہلو غالب آگیا ہے اور وہ اسلام کو صرف ایک سسٹم ونظام کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کی تعبیر کا عنوان صرف ایک کامل نظام ریاست ہے۔ اس فکر نے جو خود موجودہ سیاسی حالات کے رد عمل کا نتیجہ ہے' مغرب کے ذہنوں کو اسلام سے الرجک اور انہیں اسلام سے وحشت زدہ کر دیا ہے۔ مغرب میں اسلام کے پیش کرنے میں اس طرز عمل وتعبیر کو ملحوظ رکھنا وقت اور مغربی نفسیات کے اعتبار سے انتہائی ضروری ہے۔ یہ طرز تعبیر ماضی میں بھی مختلف ملکوں اور قوموں میں نسخہ بے خطا ثابت ہوا ہے اور اب بھی اس کی کامیابی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان جن کے پاس خدا تعالیٰ کا آخری پیغام پوری طرح محفوظ ہے اور رسول خدا ﷺ کی سیرت وحیات اور تعلیمات کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے' آگے بڑھ کر مغرب کا ہاتھ تھامیں اور انہیں تباہی سے بچائیں۔ کیونکہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو رہتی دنیا تک انسانوں کے جسم وروح اور دنیا وآخرت کی تمام ضرورتوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔

مغرب میں اسلام کا مستقبل

مغرب میں اسلام کا مستقبل' یہ وہ سوال ہے جو اس وقت مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں بڑے شد و مد سے اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ موضوع اس وقت سے سنجیدہ و مربوط موضوع کی شکل اختیار کر گیا ہے جب سے ہارورڈ یونیورسٹی کے یہودی پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۳ء میں تہذیبوں کے مابین تصادم (Clash of Civilizations) کا نظریہ پیش کر کے پیشین گوئی کی کہ مستقبل میں مغرب اور اقوام عالم کے درمیان کشمکش نہ تو معاشی ہوگی نہ سیاسی بلکہ تہذیبی ہوگی۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلام کو مغرب کے مقابلے میں ایک متصادم تہذیب کے طور پر پیش کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ویسٹرن سولائزیشن کے لیے اسلام کا خطرہ دکھا کر اسلام کے خلاف محاذ آرائی کے لیے دعوت فکر دی۔ مغربی ملکوں میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی بھی وجہ فکر بنی ہوئی ہے۔ مسلمان امریکہ میں دوسری بڑی اکثریت بن چکے ہیں اور یورپ میں ان کی آبادی ۲۵ ملین کے قریب پہنچ رہی ہے۔ آل یورپ (ری رسی سی) کے کئی ملکوں میں اسلام کو دوسرا بڑا مذہب تسلیم کیا جا چکا ہے۔

حقیقت میں موجودہ دور فکر و نظریہ کا دور ہے' اس وقت اقوام عالم کے درمیان عسکری کے بجائے فکری و نظریاتی تصادم برپا ہے۔ کیمونزم کی ناکامی کے بعد مغربی دنیا سمجھنے لگی ہے کہ اب دنیا کے لیے مغربی نظریہ فکر اور نظام زندگی اپنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں جب کہ اسلام ایک مکمل نظریہ فکر رکھتا ہے جس میں آج بھی اتنی افادیت و کشش ہے کہ دنیا کے تمام نظریات و افکار پر حاوی و غالب آجائے۔ اسلام کی پوری تاریخ ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی دعوت ہی اس کی سب

سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی صورت میں کسی انسان کے سامنے لایا جائے تو وہ سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی ذات میں ایک تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو متاثر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اب تک نظریہ کو کاٹنے والی تلوار وجود میں نہیں آسکی۔ اسلام کے نظریہ و فکر کی تلوار کبھی کند نہیں ہوتی۔

اس نے ہر دور میں قطع نظر اس سے کہ وہ دور سیاسی و عسکری اعتبار سے مسلمانوں کے غلبہ کا دور تھا یا مغلوبیت کا' اپنی شاندار فتوحات برابر جاری رکھیں۔ زمانہ کی موجودہ تبدیلی عسکری محاذ سے فکری محاذ کی طرف عین اسلام کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اسلام کے نظریہ کی طاقت سے خوفزدہ ہے۔ وہ مغرب میں اسلام کو اپنی فکر و دعوت پیش کرنے کا موقع دیے بغیر پروپیگنڈہ اور میڈیا کے زور پر اسے ختم کر دینا چاہتا ہے۔

آیئے تاریخی اعتبار سے اس صورت حال کا جائزہ لیں کہ اسلام کے نظریہ و فکر نے کس طرح ہر دور میں اپنی طاقت منوائی۔ اسلام کے غلبہ کی پیشین گوئی

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون

"اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت و دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اسے سارے ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرک اسے برا مانیں۔"

یہاں دین کے غلبہ سے مراد سیاسی و عسکری غلبہ نہیں بلکہ فکری و نظریاتی غلبہ ہے جو اسلام کو ہمیشہ اور ہر جگہ رہا ہے اور کبھی منقطع نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف سیاسی غلبہ کبھی حاصل ہوا' کبھی نہیں۔ خالق کائنات نے اپنے آخری پیغام (اسلام) کو صحیح انسانی علم اور سائنس کے معیار پر مبرہن و مدلل کر دیا۔ جب کسی فکر و نظریہ کو یہ سب حاصل ہو جائے تو اس کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے دعوت و فکر کے لیے افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنے کی خاطر کفار مکہ کی

یکطرفہ شرائط بھی منظور فرمالیں۔ اسلام کی دعوت کے مرحلہ میں ایسا بھی ہوا کہ دعوت کی حکمت کے پیش نظر آپ نے بظاہر عسکری میدان میں پسپائی اختیار کی تا کہ مکمل نظریاتی غلبہ و فتح یابی حاصل ہو سکے' جیسے حدیبیہ میں ہوا۔ ۶ھ میں آپ کو عمرہ کی نیت سے ڈیڑھ ہزار صحابہ کو لے کر بیت اللہ کے بالکل قریب پہنچ کر بغیر عمرہ کیے لوٹنا پڑا۔ حدیبیہ میں کفار سے جو صلح نامہ ہوا اس کی شرائط یکطرفہ کفار مکہ کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ بظاہر مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت اور انہیں اشتعال دلانے والی تھیں۔ اس صلح سے آپؐ کا مقصد اسلام کے لیے افہام و تفہیم کے ذریعے معتدل ماحول و فضا پیدا کرنا تھا۔ اہل مکہ مسلمانوں کو مشتعل کر کے اپنے موافق میدان یعنی عسکری میدان میں لانا چاہتے تھے جس میں قریش کو مسلمانوں پر واضح برتری حاصل تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ آپؐ حکمت عملی سے ان کو ایسے میدان میں لے آئے جہاں مسلمانوں کو مکمل طور پر برتری و بالادستی حاصل تھی یعنی فکری و نظریاتی میدان میں تا کہ اہل مکہ کے ساتھ جنگ کا ماحول ختم ہو اور انہیں ٹھنڈے دل سے اسلام کی دعوت و فکر پر غور کرنے کا موقع ملے نیز آپ کو بھی دیگر عرب قبائل اور سلاطین عالم تک اپنی دعوت پہنچانے کا موقع مل سکے۔

قرآن کریم نے آپؐ کی اس حکمت عملی کو فتح مبین قرار دیا۔ بعد کے واقعات نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ حدیبیہ کی صلح سے پہلے بیس سال میں جس قدر لوگ مسلمان ہوئے تھے' اس صلح کے بعد اس سے کہیں زیادہ لوگ دو سال کے اندر اسلام میں داخل ہوئے اور حالات میں آپ کے حق میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ صرف دو سال بعد ۸ھ میں آنحضرت ﷺ دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ فاتحانہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوگئے۔ اگرچہ حدیبیہ کا واقعہ بظاہر عسکری محاذ پر پسپائی کا واقعہ ہے مگر دعوت و فکر کے محاذ پر زبردست اقدام و فتح یابی کا سنگ میل ہے۔ ایک صحابی حضرت براءؓ فرماتے ہیں' ''تم فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور ہم فتح حدیبیہ کو سمجھتے ہیں۔''

آج تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ مغربی میڈیا مسلمانوں کو مشتعل کرنے میں لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان رد عمل کا شکار ہو جائیں۔ ہمارے لیے صلح حدیبیہ ایک سبق اور نشان راہ ہے کہ اسلام کی دعوت پیش کرنے والے جب کبھی مخاطب کی اشتعال انگیزیوں کو نظر انداز کر کے صبر و استقامت کے ساتھ اسلام کی دعوت و فکر کو پیش کریں گے تو انجام وہی نکلے گا جو ٦ھ میں نکلا تھا کیونکہ مغرب بھی اہل مکہ کی طرح فکر و نظریہ کے میدان میں تہی دامن ہے۔

آیئے اس حوالے سے تاریخ کی چند مثالوں پر نظر ڈالیں۔

مسلمانوں کی سیاسی طاقت ٹوٹنے کے باوجود فکری محاذ پر شاندار کامیابیاں

تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں منگول تاتاریوں نے عالم اسلام پر مکمل غلبہ حاصل کیا۔ انہوں نے سمرقند سے بغداد تک پوری مسلم دنیا کو تہس نہس کر دیا۔ ان کا غلبہ اتنا شدید اور ہمہ گیر تھا کہ کہا جانے لگا کہ "اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس کو نہ ماننا" ان حالات میں چند بے وسائل درویشوں نے اسلام کی دعوت و فکر پیش کرنے کا خاموش و پر امن کام شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک انقلاب برپا ہوا اور اس صدی کے اختتام سے پہلے تاتاری اسلام کی فکر و طاقت سے مغلوب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ پروفیسر ہٹی کے الفاظ میں مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ انہی تاتاریوں کی اولاد نے عظیم خلافت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ یورپ ان کے زیر نگیں تھا اور باب عالی (سلطنت ترکیہ) کی مرضی کے بغیر یورپ میں کوئی اہم فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی تاتاری نسل کی ایک دوسری شاخ (مغلوں) نے ہندوستان میں صدیوں تک حکومت کی۔

پروفیسر ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب "دعوت اسلام" (Preaching of Islam) میں لکھتے ہیں

"اپنے سیاسی زوال کے زمانے میں اسلام نے بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل

کیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمدؐ کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی ترکوں نے اور تیرہویں عیسوی میں مغل ترکوں نے مگر عجیب بات ہے کہ ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کیا"

یعنی اسلام کے نظریہ و فکر کی طاقت نے ان قوموں کو فتح کر لیا جنھوں نے عسکری میدان میں مسلمانوں کو شکست دی تھی۔

آج دنیا میں کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ ایک میدان سیاست و عسکریت کا ہے جہاں مغرب کو عالم اسلام پر مکمل بالادستی حاصل ہے' دوسرا میدان نظریہ و فکر کا ہے جہاں اسلام کو مکمل غلبہ حاصل ہے۔ مغرب مسلمانوں سے اس میدان میں لڑنا چاہتا ہے جہاں اسے بالادستی حاصل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم حکمت عملی اختیار کر کے اسے ایسے میدان میں لے آئیں جہاں وہ ناموافق پوزیشن میں ہو اور ہم موافق پوزیشن میں ہوں یعنی نظریہ و فکر کے میدان میں۔

تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیے' اس وقت انڈونیشیا آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا مسلم ملک ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کی کثرت کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں نے کبھی بھی فوجی اقدام نہیں کیا۔ اس خطہ میں مسلمانوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں اپنے قدم جمائے۔ یہی وہ صدی ہے جس میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت پر زوال آیا۔ ایک طرف اسپین سے مسلمانوں کو ختم کیا گیا' دوسری طرف تاتاریوں نے پانچ سو سالہ عظیم الشان عباسی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس وقت اگرچہ مسلمانوں کی عسکری و سیاسی طاقت ٹوٹ چکی تھی مگر مسلمانوں کی روحانی و فکری فتوحات بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھیں۔ تیرہویں صدی اگرچہ مسلمانوں کے عسکری زوال کا دور ہے جب مسلمانوں کا دار السلطنت بغداد تباہ ہو رہا تھا اور یورپ (سپین) سے انہیں نکالا جا رہا تھا۔ مگر عین اس وقت اسلام کے فکر و نظریہ کی طاقت مشرق بعید انڈونیشیا' ملیشیا کو فتح کر رہی تھی اور وہاں اپنے قدم جما رہی تھی۔ اور آگے بڑھئے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی و عسکری طاقت زوال کی انتہا کو پہنچ گئی حتیٰ کہ ایسٹ

انڈیا کمپنی نے دار السلطنت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ۱۸۵۷ء میں شاملی کے میدان میں جن علماء نے انگریز سے شکست کھائی ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی تھے مگر چند سال بعد جب یورپ کے پادری فنڈر نے فکری و نظریاتی میدان (مناظرہ) میں مسلمانوں کو للکارا تو انہی مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اسے ایسی شکست دی کہ وہ ہندوستان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تاریخ میں بار بار نظر آئے گا کہ مسلمان عسکری میدان میں مغلوب ہوگئے مگر جب کبھی فکری و نظریاتی تقابل ہوا تو اسلام کو دنیا کے ہر مذہب اور ہر نظریہ فکر پر مکمل بالادستی حاصل ہوئی۔

یہ بات مسلمانوں کے حق میں خوش آئند ہے کہ مغرب میں اسلام کی اندھی مخالفت و عصبیت کے بادل گزشتہ صدی سے چھٹنے شروع ہوگئے تھے اور اہل مغرب کو اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے مبنی بر تعصب غلط رویہ کا شدید احساس ہو چلا ہے۔ چنانچہ مشہور انگریز ادیب جارج برنارڈ شا ایک جگہ لکھتا ہے ''محمد کے پیش کردہ دین کو ادیان عالم میں بہت ہی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ دیگر ادیان کے برعکس اس دین میں دا نما'' زندہ رہنے کی حیرت انگیز قوت موجود ہے' اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اپنے اندر مختلف طریقوں کو سمونے کی طاقت رکھتا ہے کہ یورپ میں بھی اسے روز بروز مقبولیت حاصل ہو رہی ہے' جہالت' تعصب کے باعث ازمنہ وسطی میں اسلام کو انتہائی بھیانک صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا اور انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام یسوع مسیح کا سب سے بڑا دشمن ہے لیکن میں محمد کو انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتا ہوں۔ اور میرا اعتقاد ہے کہ اگر آج بھی دنیا کو محمد کی خوبو رکھنے والے کسی شخص کی خدمات میسر آجائیں تو بنی نوع انسان کی تمام مشکلات یکسر دور ہو سکتی ہیں اور زمین میں امن و امان اور خوش بختی کا دور شروع ہو سکتا ہے۔ آج زمانہ کو انہی چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔''

اسی طرح جارج برنارڈ شاہ ایک اور جگہ یورپ میں اسلام کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''میری اپنی قوم اور یورپ کے دیگر ممالک کے متعدد اشخاص اسلام قبول کر چکے ہیں اور اب یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ

یورپ کے کلیتہً اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔"

برنارڈ شاہ کے علاوہ مغرب کے اور بھی بڑے بڑے مفکرین نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں کار لائل اور گبن جیسے مفکرین نے اسلام کو حقائق وانصاف کی کسوٹی پر پرکھا اور جو نتائج اخذ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے' ان کی بنا پر یورپ والوں کے نقطہ نظر میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آنی شروع ہوئی اور انہوں نے اسلام پر ہمدردانہ نظر سے غور کرنا شروع کیا۔ موجودہ بیسویں صدی میں تو اسلام کے متعلق اہل یورپ کے نقطہ نظر میں بہت زیادہ تبدیلی آچکی ہے اور نفرت و عداوت کی جگہ اسلام کی عظمت و محبت نے لے لی ہے۔ اس رفتار کو دیکھتے ہوئے کچھ تعجب نہیں کہ اکیسویں صدی میں اسلام پورے طور پر اہل یورپ کے دلوں میں گھر کر جائے اور اسے وہ نجات کا ذریعہ سمجھ کر جوق در جوق اس میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

حالات سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ انسانی ضمیر آہستہ آہستہ تکمیل کے مدارج طے کر رہا ہے اور یہ مقرر ہو چکا ہے کہ جلد یا بدیر دنیا آلام و مصائب کے چکر سے نجات حاصل کر لے۔ اس کے آثار نظر آرہے ہیں کہ زمین کی طنابیں کھنچ چکی ہیں۔ باشندگان ارض کو میل ملاپ کی جو سہولتیں آج میسر ہیں ایسی پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ چھاپہ خانوں کی بدولت کتابوں کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے اور کسی بھی علم و فن اور مذہب و ملت کے متعلق معلومات کا دستیاب ہونا دشوار امر نہیں رہا۔ صحافت جو خیالات و عقائد کی اشاعت کا نہایت موثر ذریعہ ہے عروج پر ہے۔ ریڈیو' ٹیلی ویژن کے بعد اب انٹرنیٹ اور سیٹلائیٹ نے دنیا کو ایک گاؤں اور مختلف ملکوں کو محلے بنا دیا ہے۔ یہ سب سامان اس یوم موعود کو قریب تر لانے کے لیے کیے جا رہے ہیں جب ساری دنیا کا ایک ہی مذہب ہو گا اور ایک ہی دین ہو گا۔ جو فضائیں آج جنگ کے نعروں سے گونج رہی ہیں کل امن و سلامتی کے ترانوں سے معمور ہوں گی اور جہاں اس وقت تعصب و جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں وہاں آفتاب اسلام طلوع ہو کر ہر قسم کی تاریکی دور کر

دے گا۔

اب وہ وقت زیادہ دور نہیں جب نبی آخر الزمان ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق ہر کچے پکے گھر میں اسلام داخل ہوگا اور روئے زمین کا گوشہ گوشہ اللہ کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔ ہم یہ بات محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کہہ رہے بلکہ بے شمار مغربی مفکرین بھی گہرے غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ جناب وحید الدین خان لکھتے ہیں ' ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں مگر وہ مدینہ ہے۔ اس حدیث سے اسلام کا طریقہ کار معلوم ہو جاتا ہے' وہ یہ کہ مکہ میں اسلامی دعوت کے لیے حالات نامساعد ہوں تو مدینہ کو دعوت کا مرکز بنا کر دوسرے علاقوں کو مسخر کرو۔ یہ طریق کار دور اول میں نہایت کامیاب رہا ہے اور موجودہ دور میں بھی اس کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ آج مغرب کو اسی طرح کے ایک قریہ کا مقام حاصل ہے۔ یہاں قدرت کے مخفی ہاتھ نے مکمل طور پر وہ حالات پیدا کر دیے ہیں جو اس دور میں یثرب میں پیدا ہوگئے تھے۔ یہاں کے لوگوں میں مختلف اسباب کے تحت اسلام سے نفرت ختم ہو رہی ہے اور دین حق کی پیاس پیدا ہو چکی ہے۔ یہاں دعوت و تبلیغ کے آزادانہ مواقع موجود ہیں۔ ابلاغ کے جدید ترین وسائل مہیا ہیں جو کسی فکر ونظریہ کی اشاعت کے موثر طور پر انجام دینے کے لیے درکار ہیں مزید کہ آج مغرب کو دنیا میں عالمی قیادت کا مقام حاصل ہے۔ اگر یہاں صبر وتحمل اور استقامت کے ساتھ موثر انداز میں دعوت الی اللہ کا کام کیا جا سکے اور اسلام کے محاسن اور انسانیت کی بہبود کے پہلوؤں کو ذہنوں میں اتار جائے تو حدیث کے الفاظ میں مغرب کا قریہ دوسرے تمام قریوں کو نگل جائے گا۔ ہمارے نزدیک مغرب میں مسلمانوں کے کرنے کا کام صرف یہی ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھیں۔ اگر وہ اسلام کی دعوت وفکر کے کام کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو خدا کی رحمتوں کے سب سے زیادہ حقدار ٹھہریں گے اور ان کا وجود یہاں کی قوموں کے لیے بھی رحمت ثابت ہوگا۔

جدید نظریاتی چیلنج اور علماء کرام

موجودہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ ان افکار و نظریات کا ہے جو اس زمانہ میں مذہب کی جگہ لے چکے ہیں۔ اسلام ایک واضح فکر و عقیدہ کا نام ہے جو اپنی سادگی حقانیت فطرت اور عقل سلیم کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے اپنے اندر زبردست کشش و قوت رکھتا ہے' دشمنان اسلام ہمیشہ اسلام کی دعوت و فکر کی طاقت سے خوفزدہ رہے۔ یورپ صلیبی جنگوں کے بعد یہ حقیقت سمجھ چکا تھا کہ اسلام کو نہ نظریہ و فکر کے میدان میں شکست دی جا سکتی ہے اور نہ عسکری میدان میں' اس نے صدیوں کے غور و فکر مطالعہ و تحقیق کے بعد مسلمانوں کو رام کرنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا جس سے مسلمان اپنی پوری تاریخ میں نا آشنا تھے۔ اسلام کے شاطر دشمنوں نے خلاف اسلام افکار و نظریات کو خوشنما بنا کر جدید انداز میں اس طرح مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتار دیا کہ جن کے قبول کرنے کے بعد خود بخود اسلام کی صداقت و حقانیت میں شکوک و شبہات پیدا ہو کر انسان اسلام کی بنیادی صداقتوں اور اساسیات سے بے گانہ ہو جاتا ہے اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ کسی بھی پہلو سے اسلام کا کھلم کھلا حریف بننے کے بجائے مذہب کا ایسا تصور پیش کر دیا جائے اور اس پر چاروں طرف سے ایسے افکار و نظریات کی یلغار کر دی جائے جو اسلام کے بنیادی عقائد و نظریات کو متزلزل کر دے اور مسلمان کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو کہ وہ اسلام کی مخالف سمت میں جا رہا ہے کیونکہ دشمن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ مسلمان اپنے مذہب کے بارے میں انتہائی ذکی الحس واقع ہوا ہے اور اسلام کی چھوٹی چھوٹی بات کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنا اس کے لیے معمولی چیز ہے اس لیے گزشتہ ڈیڑھ دو صدی سے اس کا حملہ ایک ایسی سمت سے ہو رہا ہے جس سے پوری تاریخ میں مسلمان ناواقف رہے ہیں انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہو تا کہ وہ آہستہ آہستہ اسلام سے بیگانہ ہو کر ایسے

افکار و نظریات کو اپنا چکے ہیں جس کے نتیجہ میں انسان اسلام کے بنیادی عقائد و فکر سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ یہ خاموش فکری حملہ گزشتہ صدیوں کے دوران عالم اسلام پر یورپ کی عسکری و سیاسی تاخت کے پس پشت تعلیم' جدید افکار کے نام پر اسلام سے تصادم لیے بغیر اس خاموشی سے داخل ہو گیا کہ مسلم علماء و مفکرین کو عرصہ تک اس کا احساس تک نہیں ہو سکا کہ اس سے کتنی تباہی آئی ہے اب بھی مغرب کی یلغار برابر جاری ہے اس کی تکنیک اور طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ براہ راست یا بالواسطہ اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا اور نہ صراحتاً" اسلام کی تردید کرتا ہے بلکہ بظاہر اسلام سے بالکل لا تعلق و اجنبی نظر آتا ہے اور اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے گویا وہ جانتا ہی نہیں کہ یہ سب کچھ اسلام کے عین ضد اور مقابل ہے۔ وہ علم و تحقیق' عقلی استدلالات اور جدید نظریات کے نام پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح و توضیح کرتا ہے جس سے خدا' رسالت و آخرت اور سرے سے مذہب کی کوئی گنجائش و ضرورت نہیں رہتی کسی مسلمان کو ذرہ برابر شک نہیں ہوتا کہ ان افکار و نظریات کا قائل ہونا اور تسلیم کرنا اسلام کے انکار کو مستلزم ہے۔ عالم اسلام یورپ کی سائنسی و ٹیکنالوجی ترقی اور دیگر عصری علوم کے میدان میں اس کی متواتر کامیابیوں اور سبقت سے مرعوبیت کے سبب علم و عقل کی اور شریعت کی کسوٹی پر کسے بغیر ان اوہام و خرافات کو علم عقل' شعور و آگہی اور ترقی کے نام پر قبول کر چکے ہیں' جب مسلمان ان افکار و نظریات کو اختیار کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ علم و آگہی ترقی یافتہ نظریات اور جدید فلسفوں کو اختیار کر رہا ہے اس طرح یہ خلاف اسلام باطل افکار اس طرح قبول کر لیے جاتے ہیں کہ ان کے دل میں اس بات کی کھٹک تک نہیں ہوتی کہ ان کے قبول کرنے سے اسلام کی نفی ہو رہی ہے۔ غرض یہ بات حرف بہ حرف صحیح ہے کہ اس پیمانے پر اس نوعیت کا فتنہ جسے بجا طور پر ایک جدید ارتداد کہا جا سکتا ہے اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا۔

۳۔ ماڈرن ارتداد کی تکنیک اور طریقہ واردات سے عام مسلمان تو کجا ہمارے

مذہبی رہنما اور علمائے کرام تک اتنے بے خبر اور ناواقف ہیں کہ انہیں اس کی اتنی بھی فکر نہیں ہوتی جتنی گزشتہ زمانہ میں چند مسلمانوں کی عیسائی یا ہندو ہو جانے سے ہوتی تھی، معلوم ہوتا ہے وہ اس طوفان کی زہرناکی، منفی اثرات، گہرائی و گیرائی کا کماحقہ شعور و احساس نہ کر سکے۔ علم و جدید فکر کی اس نظریاتی یلغار کو بجا طور پر جدید ارتداد کہا جا سکتا ہے، مذاہب اور ارتداد کی تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی معاشرہ میں ارتداد دفعتاً" نہیں آتا بلکہ اس کے اثرات تدریجاً" رو نما ہوتے ہیں پہلے باطل نظریات و افکار سے دل و دماغ متاثر ہوتا ہے اسلام کے بنیادی عقائد و تصورات سے اعتماد متزلزل ہوتا ہے۔ ایمانیات میں شکوک و شبہات در آتے ہیں پھر اس کے اثرات عمل پر پڑتے ہیں اجتماعی معاملات (اقتصادیات، سیاست، نظم ونسق، اور قانون) میں اسلام ناقابل عمل نظر آتا ہے۔ پھر عبادت نماز روزہ وغیرہ میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے آخر میں زبان پر بھی آتا ہے یعنی لسانی سے پہلے قلبی و عملی ارتداد آتا ہے۔ اب مغرب کے جدید تکنیک و طریقہ واردات نے یہ سہولت بھی مہیا کر دی ہے کہ زبان پر لانے کی ضرورت ہی نہیں اس کے نزدیک مسلم معاشروں میں داخل رہ کر ہی اس کی بہترین خدمت انجام دی جا سکتی ہے پہلے زمانہ میں جب کوئی مسلمان کسی باطل مذہب کے اثرات قبول کرتا تھا تو ضروری تھا کہ وہ کسی گرجا یا مندر میں جا کر شدھی یا بپتسمہ کی رسمی کارروائی سے گزرے۔ گلے میں صلیب ڈالے یا ماتھے پر قشقہ لگائے اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو جاتا اور اسلام سے اس کی دشمنی آشکارا ہو جاتی اور دوسرے مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا ہو جاتے لیکن اسلام پر یہ نیا حملہ کسی مذہب کے نام پر نہیں بلکہ علم و عقل، شعور و آگہی، فلسفہ و نظریات کے نام پر ہوا ہے اور اس نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد و افکار و نظریات سے الگ ہو کر بھی مسلمانوں کے معاشرہ میں مسلمان بن کر رہیں ان ہی میں شادی بیاہ کریں، دوستی رشتہ داری، میل ملاپ اور کھانے پینے کے تعلقات قائم رکھیں۔ کبھی کبھی رسمی طور پر ان کی

عبادات (جمعہ' عیدین) میں بھی شریک ہوں' ان لوگوں کو مسلم معاشرہ میں ان کے تمول اور تعلیم و سیاست میں امتیاز کی وجہ سے خصوصی عزت و توقیر کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں امتیازی درجہ دیا جاتا ہے' وہ بڑی شان وشوکت سے مسلم گھرانوں میں شادی رچاتے ہیں۔ مرنے کے بعد بڑے بڑے مجمع ان کا جنازہ پڑھتے ہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کے ماڈرن مرتد فقط اپنی ذات تک ہی ایسی راہ اختیار نہیں کرتے جو اسلام کے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے بلکہ آگے بڑھ کر یہ حضرات تعلیم و سیاست میں ممتاز ہونے کی وجہ سے سیاست و حکومت' کونسلوں اور اسمبلیوں' وزارتوں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر اور اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان ہو کر مسلمانوں کے اعلانیہ نمائندے کہلاتے ہیں۔ بلکہ ان کے حساس ترین اور کلیدی مسائل کو اپنے نظریات و صوابدید کے مطابق طے کرتے ہیں' دشمنان اسلام (یہود و نصاریٰ ہنود) سے سیاست و حکمرانی' ثقافت و کلچر' اقتصادیات و تجارت' تعلیم و آرٹ کے حوالہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں' بیرونی اسلام دشمن طاقتیں انہیں اپنا نمائندہ بنا کر جوش و خروش سے ان کا استقبال کرتی ہیں کیونکہ فی الحقیقت یہ لوگ انہی بڑی طاقتوں کا کام کر رہے ہوتے ہیں' مغربی میڈیا انہیں مسیحا بنا کر پیش کرتا ہے اور بڑی طاقتیں ان کے واسطے سے ترقی و خوشحالی کے نام پر مسلم ملکوں اور معاشروں میں اپنی پالیسیاں' نظریات' ثقافت و کلچر پوری آزادی و سہولت سے نافذ کرتی ہیں اور ان لوگوں کے واسطے سے مسلم ملکوں کی اقتصادیات' تجارت تعلیمی و تمدنی مراکز معاشرت غرض ہر ہر میدان میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتی جاتی ہیں' ان بیرونی طاقتوں کے لیے یہ راستہ براہ راست مسلم قوموں و ملکوں کو غلام بنا کر ان پر کنٹرول کرنے کی ہزاروں دقتوں اور پریشانیوں کی نسبت آسان و کم خرچ اور بے خطر نظر آتا ہے جب کبھی یہ اسلام دشمن طاقتیں یہ دیکھتی ہیں کہ ان لوگوں میں کوئی اپنے عوام پر گرفت کھو چکا ہے اور اس کے واسطے سے اپنی تجارتی و معاشی' تہذیبی و تمدنی' فکری و نظریاتی پالیسیاں جاری رکھنی دشوار ہو گئی ہیں' اور عام لوگ ان سے بیزار ہو کر اسلام کی طرف دیکھنے لگے ہیں تو بڑی

چابک دستی و ہوشیاری سے وہ اس مہرہ کو ہٹا کر دوسرا مہرہ لے آتی ہیں جو ان کی حسب ہدایت وقتاً" فوقتاً" اسلام اسلام کی تسبیح بھی پڑھتا ہے اور ضرورت پڑے تو عمرے بھی کرتا ہے ہاتھ میں تسبیح پکڑ لیتا ہے پھر دوبارہ عالمی میڈیا (جس پر اسلام دشمن طاقتوں کی مکمل اجارہ داری ہے) اس کا امیج بنانے میں جت جاتا ہے اس طرح مسلم قوم اور ملک اس دوسرے مہرے کے ساتھ چلنے لگتے ہیں' استعماری طاقتوں سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہر مسلم ملک کی یہی مسلسل کہانی ہے کہ ان کے حکمرانوں اور سربر آوردہ طبقہ کے دل و دماغ پر قرآن و محمدؐ کے بجائے مغربی افکار و نظریات کی حکمرانی رہی۔

مسلم دنیا کی بھاری اکثریت جو اسلام اور قرآن پر غیر متزلزل یقین و ایمان رکھتی ہے وہ اپنی سادگی و سادہ لوحی سے یہ سمجھتی ہے کہ پہلے چند سال ملک کو معاشی استحکام وخوش حالی حاصل ہو جائے تو ہمارے حکمران خود بخود قرآن وسنت کی شاہراہ پر لے چلیں گے اس خوش فہمی میں قوم ان کے قدم بقدم ساتھ چلتی رہتی ہے۔ مسلم ملکوں میں اگرچہ مغربی تہذیب و افکار کے نمائندوں کی تعداد ۲۔۴ فیصد سے زیادہ نہیں مگر ان افراد کی طاقت اور وسعت اختیار کا یہ حال ہے کہ وہ سیاست و حکومت' تجارت و معیشت' تعلیم وُ ذرائع ابلاغ پر پوری طرح حاوی و قابض ہونے کی وجہ سے بہ آسانی اسلام کا درد و فکر رکھنے والی جماعتوں' تنظیموں اور علماء کو کچل دیتے ہیں اور جدید ذرائع ابلاغ کے پراپیگنڈے کے زور پر انہیں علم و سائنس اور ترقی و خوشحالی کا دشمن ظاہر کر کے پیچھے دھکیل دیتے ہیں' دینی جماعتیں اور علماء ذرائع ابلاغ میں اپنا نقطہ نظر تک پیش نہیں کر پاتیں اور اس گھناؤنے طریقے پر ان کی کردار کشی کی جاتی ہے کہ وہ دیوار سے لگ جاتی ہیں اور اس سارے عمل میں انہیں بیرونی اسلام دشمن طاقتوں اور عالمی میڈیا کی بھرپور آشیر باد حاصل رہتی ہے پھر اطمینان سے یہ لوگ اپنے بیرونی سرپرستوں اور آقاؤں کے مفادات پورے کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی

اسلام کو اس صورت حال سے اور اس نوعیت کے فکری و نظریاتی حملہ سے سابقہ نہیں پڑا تھا یہ فکری یلغار جتنی عام اور ہمہ گیر تھی بظاہر اتنی ہی سادہ اور مذہب سے بے تعلق دکھائی دیتی تھی بد قسمتی سے مذہبی طبقہ اور علمائے کرام گزشتہ کئی صدیوں سے علمی و فکری اعتبار سے دور زوال میں ہیں انہوں نے خود اپنے اوپر علم و تحقیق و اجتہاد کے دروازے بند کر لیے ہیں وہ قرون وسطی کی ان لا یعنی لفظی بحثوں کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں جن کی اس دور میں کوئی افادیت و اہمیت باقی نہیں رہ گئی' خاص طور پر گزشتہ دو صدیاں عالم اسلام کے لیے انتہائی نکبت و ادبار' شکستگی و مایوسی' غلامی و غیروں کی نقالی میں گزری ہیں ان میں علماء کا جمود و حالات سے بے خبری' عصری علوم سے ناواقفیت جدید افکار و نظریات سے بے تعلقی اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے کی بصیرت و شعور سے دور جا پڑے تھے اس لیے وہ ان جدید افکار و نظریات کی چھان پھٹک کر کے انہیں قرآن و سنت اور علم و عقل کی میزان پر تولنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے اس طرح علمائے کرام اس نئے آنے والے فکری طوفان سے بڑی حد تک غافل اور بے خبر رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اب تک اس نئے حملے کی نوعیت و گہرائی کو سمجھ نہیں پائے کیونکہ اسلام کے فکری نظام اور بنیادی عقائد پر تیشہ چلانے والے یہ کفریہ افکار و نظریات کسی مذہب کے نام پر نہیں بلکہ عقل و دانش اور جدید تھیوری و فلسفوں کے نام سے داخل ہوئے تھے ان کے اثر و نفوذ کا یہ عالم ہے کہ کروڑہا مسلمان اس کی زد میں بہہ کر اسلام کی اساسیات اور بنیادی عقائد سے بیگانہ ہو گئے اور خبر تک نہیں ہوئی کہ ماڈرن نظریات کے نام پر کتنی زبردست تباہی ملت اسلامیہ میں آئی ہے۔

اس مسئلہ کی طرف نصف صدی پیشتر غالباً" سب سے پہلے جدید طبقہ میں ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم نے توجہ دلائی تھی اور طبقہ علماء میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس مسئلہ پر لکھا ان کے بعد مفکر اسلام مولانا ابو الحسن علی ندوی" نے دمشق سے نکلنے والے "اخوان المسلمین" کے آرگن رسالہ "المسلمون" میں

"ردۃ جدیدۃ" کے نام سے دو قسطوں میں لکھا جس کا اردو ترجمہ اس وقت الفرقان میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے نام سے شائع کیا اس کے بعد پھر مسلسل خاموشی ہے حالانکہ مرض کی صحیح نشاندہی کے بعد اس عرصہ میں کئی علمی و تحقیقی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ ذہنوں کو سامنے رکھ کر عصری اسلوب میں طاقتور لٹریچر اور جدید علم کلام کا پورا کتب خانہ وجود میں آجانا چاہیے تھا میں معذرت کے ساتھ پھر وہی بات کہوں گا کہ عالم اسلام کی سیاسی آزادی کے بعد بھی ہمیں علمی و فکری غلامی سے نجات نہ مل سکی اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے' ضرورت ہے کہ وہ اس خول سے باہر نکلنے کی جرات کریں جو انہوں نے قرون وسطی میں قرآن و سنت کی تعبیر و تفہیم کے لیے یونانی و اشراقی باطل افکار کا حصار اپنے گرد بنا رکھا ہے' اس طرح وہ اب تک ان لفظی موشگافیوں اور لایعنی فرسودہ افکار کے دھندلکے کی وجہ سے عصر حاضر کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھ رہے ہیں کہ ارسطو و جالینوس فارابی و بو علی سینا کے افکار و نظریات کی تردید سے انہیں خود بخود آج کے جدید افکار و نظریات کا بھی جواب مل جاتا ہے اس لیے انہیں ان کے مطالعہ و تحقیق اور تجزیہ کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں حالانکہ وقت کا تقاضہ ہے کہ جدید نظریات سے آنکھیں چرانے کی بجائے جرات سے ان کا سامنا کریں اور انہیں قرآن و سنت اور علم و عقل کی کسوٹی پر پرکھیں اور ان کا پوسٹ مارٹم کر کے ان سے غیر اسلامی اجزاء کو اس طرح خارج کریں جس طرح ان کے اسلاف نے تیسری صدی ہجری میں یونانی و اشراقی افکار کا کیا تھا۔

ہمارے نزدیک صورت حال کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ علمائے کرام اس فاصلہ کو ختم کریں جو گزشتہ کئی صدیوں سے ان کے اور نئی نسل کے درمیان بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ان کے اور عصری علوم و تقاضوں کے درمیان پیدا ہو گیا ہے اور عصری علوم و افکار سے بے خبری کو ختم کریں' موجودہ فکری و نظریاتی چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہے کہ یورپین زبانوں' سائنٹفک طرز

تحریر' جدید ترین ذرائع ابلاغ عصری تکنیک و اسلحہ سے پوری طرح واقف ہوں اور قرون وسطی کے فلسفہ اور منطق اور یونانی و ایرانی افکار کے ماحول سے باہر نکلیں جو اس وقت ایک وقتی ضرورت کے تحت اختیار کیے گئے تھے تو انہیں قرآن و سنت سے عصری گمراہیوں اور فکری چیلنجوں کا علمی و فکری میدان میں جواب دینے کی پوری رہنمائی ملے گی اس لیے کہ قرآن و سنت ہر ہر دور کی کجی و بے راہ روی اور فکری و نظریاتی ضلالت و گمراہی سے نکال کر شاہراہ علم و حقیقت فوز و کامرانی پر گامزن کرنے کے لیے بالکل کافی ہے' شرط یہ ہے کہ دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے

مغربی دانشوروں کے دو گروہ

یورپ اور امریکہ میں گزشتہ ربع صدی میں مختلف معاشی' سیاسی' تعلیمی عوامل ووجوہات کی بناء پر اتنی بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہوئے ہیں جس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے' مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان یورپ کی دوسری بڑی قوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ای ای سی (آل یورپ) میں لگ بھگ ڈھائی کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ آئندہ چند برسوں میں ای ای سی میں مشرقی یورپ کے ممالک کے داخل ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی اس تعداد میں مزید گرانقدر اضافہ ہوگا اور اس میں ایک اہم اور جوہری فرق یہ بھی ہوگا کہ مشرقی یورپ میں بسنے والے مسلمان تارکین وطن نہیں بلکہ خود اسی سرزمین کے فرزند ہوں گے۔ اسی طرح امریکہ میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ۵ ملین کے لگ بھگ مسلمان آباد ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مغربی پریس کے مطابق اس عشرہ کے اختتام تک امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے زیادہ ہو جائے گی یعنی امریکہ میں بھی مسلمان دوسری بڑی قوم کی حیثیت اختیار کر جائیں گے۔ فطری طور پر مسلمان نسلیں مغربی کلچر' تمدن' معاشرت اور فکر کے اثرات قبول کر رہی ہیں اور کسی حد تک مغرب پر اپنے اثرات ڈال بھی رہی ہیں۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ مستقبل میں مغرب میں ان دو بڑے مذاہب اور قوموں کے تعلقات کی اثر اندازی یا اثر پذیری کی نوعیت کیا ہوگی؟ مسلمان اور عیسائی دنیا کی دو بڑی قومیں ہیں جن کا

مذہب، تمدن و کلچر، نظام فکر و نظام حیات الگ الگ ہے۔ مغربی دانشور مسلمانوں کے تعلق سے دو مختلف زاویہ فکر رکھتے ہیں۔ ان کی سوچ کے دو مستقل دائرے ہیں۔ مغربی دانشوروں کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ آئندہ چند دہائیوں تک ان دونوں قوموں کے روابط میں کچھ جھجک، ذہنی کشمکش رہے گی لیکن آہستہ آہستہ مسلمان نسلیں یہاں کی معاشرت، طرز زندگی، کلچر اور روایات اپنا کر ایک مغربی قوم کے قالب میں ڈھل جائیں گی۔ اگرچہ ان کا مذہب (عبادت کا طریقہ) الگ رہے گا مگر تمدن و معاشرت، عادات واطوار، مزاج و فطرت کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک مغربی قوم کے سانچہ میں ڈھل جائیں گی جس طرح ماضی میں دو مرتبہ بڑی تعداد میں مسلمان ہجرت کر کے مغرب میں آباد ہوئے اور چند نسلوں کے بعد بالاخر یہاں کے کلچر و تمدن، افکار و نظریات نے انہیں ہضم کر لیا۔ پہلی بار پندرھویں صدی عیسوی میں اسپین میں مسلم سلطنت ختم ہونے کے بعد وہاں سے بڑی تعداد میں مسلمان امریکہ پہنچے۔ دوسری بار انیسویں صدی کے اوائل میں مشرقی یورپ اور مختلف عرب ممالک سے مسلمان امریکہ پہنچے۔ آہستہ آہستہ مغرب کا کلچر و تمدن اختیار کر کے مقامی آبادی میں ضم ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک جان ہو کر اپنا تشخص ختم کر بیٹھے۔ مغربی دانشوروں کا ایک طبقہ جو کچھ وسیع القلب ہے اور اسلام کے محاسن و خوبیوں کا ادراک رکھتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ ماضی کے برعکس بیسویں صدی میں اسلام مغرب میں اپنے قدم جما چکا ہے۔ اب مغرب اور اسلام کو ایک دوسرے کی اقدار و روایات کا تبادلہ کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور وسعت قلبی و رواداری کے ساتھ ایک دوسرے کے نقطہ کو سمجھنا چاہئے اور ایک دوسرے کے افکار و اقدار اپنائے جانے چاہئیں۔ ان دانشوروں میں سرفہرست برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس ہیں چنانچہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں آکسفورڈ کے اسلامی سینٹر میں ایک تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا

"ہماری تہذیب و تمدن پر اسلامی دنیا کے جو احسانات ہیں، ہم ان سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ وسط ایشیا سے بحر اوقیانوس کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی

اسلامی دنیا علم ودانش کا گہوارہ تھی لیکن اسلام کو ایک دشمن مذہب اور اجنبی تہذیب قرار دینے کی وجہ سے ہمارے اندر اپنی تاریخ پر اس کے اثرات کو نظر انداز کرنے یا مٹانے کا رجحان رہا۔ ہم نے اسپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی تہذیب کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ مغرب میں احیاء تہذیب کی تحریک پر مسلم اسپین نے گہرے اثرات ڈالے۔ یہاں علوم کی ترقی سے یورپ نے صدیوں بعد تک فائدہ اٹھایا۔ دسویں صدی میں قرطبہ یورپ کا مہذب ترین شہر تھا۔ اس کے حکمران کی لائبریری میں موجود ۴ لاکھ کتب پورے یورپ کی لائبریریوں کی کتب کی تعداد سے زائد تھیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ یورپ سے چار سو سال پہلے مسلمانوں نے چین سے کاغذ بنانے کی مہارت حاصل کی۔ سفارت کاری' آزاد تجارت' کھلی سرحدیں' علمی تحقیق کے طریقے' ایٹی کیٹ' فیشن' ہسپتال' ادویات سب کچھ اس عظیم شہر سے ہی آتے تھے۔ اپنے وقت میں اسلام رواداری کا مذہب تھا جس نے یہودیوں اور عیسائیوں کو ان کے عقائد کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دی اور ایسی مثال پیش کی جس پر بدقسمتی سے کئی صدیوں تک یورپ عمل نہ کر سکا۔ یہ بات حیرت ناک ہے کہ اسلام کو یورپ میں پہلے اسپین اور پھر بلقان میں اتنا طویل عرصہ دخل رہا۔ اس نے ہماری تہذیب کی تعمیر میں جسے ہم اکثر غلطی سے صرف مغربی قرار دیتے ہیں' اپنا حصہ ادا کیا۔ دراصل اسلام ہمارے ماضی اور حال کا حصہ ہے۔ اس نے جدید یورپ کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ اسلام ہمارا ورثہ ہے۔ اس دنیا میں مل جل کر رہنے کے لیے اسلام کے دامن میں وہ کچھ ہے جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلام میں پوری زندگی ایک اکائی ہے۔ مغرب کی ساری ترقی یک رخی ہے۔ اگر ہم نے زندگی کے ہمہ جہتی انداز کو نہ سمجھا تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس دھارے میں بہہ جائیں جہاں ہمارا علم ہمیں کار جہاں سکھائے اور ہم دنیا کے حسن وتوازن کو بگاڑ دیں۔ دنیا کے بارے میں احساس مسئولیت اور اس کی نگرانی و بہبود کی ذمہ داری کا جو تصور اسلام نے دیا ہے' ہم مغرب میں اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے اور نہ مناسب کہ ماضی کی سیاست اور علاقائی تلخیوں کو دوبارہ زندہ کریں۔ ہمیں اپنے تجربات میں ایک دوسرے کو شریک کرنا ہوگا۔ باہم تبادلہ خیال کرنا ہوگا۔ ثقافتی ورثہ میں جو کچھ مشترک ہے، اسے اپنانا ہوگا۔ ہمیں تدبر کی اہمیت کو محسوس کرنا ہوگا تا کہ ہمارے ذہن کشادہ ہوں اور دلوں کے قفل کھلیں۔ یقیناً عالم اسلام اور مغرب ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہیں۔ ضروری نہیں کہ ان میں تصادم ہو۔ اسلام اور مغرب ایک دوسرے کو بہت کچھ دے سکتے ہیں"

اس کے برخلاف مغربی دانشوروں کا جو طبقہ اسلام سے الرجک ہے، اسے اسلام کی صورت میں ایک خطرناک دشمن نظر آرہا ہے۔ وہ مغربی اقوام میں اسلام دشمنی کے صلیبی جذبات پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ مغربی دانشوروں کا یہ طبقہ مغرب میں مسلمانوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی آبادی سے بھی خوف محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر مغربی اقوام نے اسلام کے تئیں اپنا رویہ سخت نہیں کیا تو مغربی اقدار اور تہذیب وتمدن کو سخت خطرات لاحق ہیں اس لیے وہ اسلام کے خلاف مغربی اقوام کو تیار کر رہے ہیں چنانچہ امریکہ کے ایک مشہور جریدے میں اس کے مدیر مارٹن بی زگ نے اپنے اوارتی نوٹ میں زور دے کر کہا ہے۔

"جس طرح روس کے آنجہانی رہنما جوزف اسٹالن نے کمیونزم کے دفاع کے لیے یورپ وامریکہ سے طویل جنگ لڑی، اسی طرح اب مغرب کو اپنے کلچر ونظریات کی بقاء کے لیے اسلام سے جنگ لڑنی ہوگی کیونکہ مسلم بنیاد پرست اپنے متشددانہ نظریات کو دنیا بھر میں پھیلانے میں مصروف ہیں جن سے نہ صرف مغرب کے سیاسی ومعاشی فلسفوں اور ان کے نظاموں، ان کے کلچر اور عالمی مفادات کو شدید خطرات لاحق ہیں بلکہ ان کے مذہبی عقائد بھی اسلام کے خطرے کی زد میں ہیں۔ اس کا مداوا سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہے"

اسی طرح امریکہ کے ایک اور یہودی اسکالر برناڈ لوئی نے واشنگٹن سے شائع

ہونے والے ایک اہم جریدے کے اپنے مضمون مسلمز آر کم انگ (MUSLIMS ARE COMING) میں امریکی ویورپی عوام کو خبردار کیا ہے کہ مغرب ان کے نظام' ان کے افکار و نظریات سخت خطرے میں ہیں مسلمان مغرب پر ثقافتی و تہذیبی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

یروشلم پوسٹ کے سابق ایڈیٹر اور معروف یہودی اسکالر (Haider Leont) نے امریکی فارن پالیسی کوارٹر کے لیے تحریر کیے جانے والی ایک آرٹیکل میں امریکی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ مسلم بنیاد پرستی کے خطرے سے نمٹنے کے لیے مسلم ممالک کی حکومتوں اور اپوزیشن کو آپس میں الجھائے رکھے نیز برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا عنوان ہے "اسلام کو عیسائیت کی مخالفت میں تشکیل دیا گیا ہے" اسی طرح چند سال پہلے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک یہودی پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن نے اپنے مشہور مقالے "دی کلیش آف سولائزیشنز" (تہذیبوں کا تصادم) میں تحریر کیا تھا کہ آئندہ جب بھی کوئی عالمگیر جنگ ہوگی' وہ سیاسی ومعاشی مفادات وتضادات کے سبب نہیں ہوگی بلکہ تہذیبوں کے مابین ہوگی اور اس میں اصلا" مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب ایک دوسرے کی مقابل ہوں گی۔ صاحب مضمون نے اہل مغرب کو مذکورہ متوقع جنگ کے لیے ہمہ وقت اور ہر طرح تیار رہنے کا مشورہ دیا اور اس سے بہت پہلے ۱۹۸۲ء میں امریکہ کے سابق صدر آنجہانی رچرڈ نکسن نے روس کو مشورہ دیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دونوں اپنی محاذ آرائی ختم کرکے کمیونزم اور سرمایہ داری کے مشترکہ دشمن (اسلام) کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو جائیں۔

غرض مغربی دانشوروں اور مفکرین کا ایک طبقہ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے لیے مغربی اقوام کو تیار کرنے اور انہیں اسلام کے خلاف ابھارنے میں کوشاں ہے۔ اگرچہ یہ طبقہ بہت مختصر تعداد میں ہے اور ان میں زیادہ تر یا تو صیونی انتہا پسند ہیں یا ان سے متاثر دانشور مگر ہمیں یہ حقیقت نہ بھولنی چاہئے کہ خواہ یہ طبقہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو مگر یہ بے پناہ اختیارات واثرات کا مالک ہے کیونکہ موجودہ

صدی میں مغرب کی اقتصادیات' سیاست اور خاص طور پر ذرائع ابلاغ پر بڑی حد تک اس طبقہ کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے۔ اس طبقہ کا فائدہ مسلمانوں اور مغربی اقوام میں زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلانے' ان میں تنفر و عداوت بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ بعد پیدا کرنے میں ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو اسلام کو ایک انتہا پسند دہشت گرد مذہب کے طور پر پیش کرتا ہے اور نہایت چالاکی و ہوشیاری سے اسلام کو ترقی کا دشمن' انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق کا مخالف' تاریک دور کی یادگار' جہالت و دقیانوسیت کا علمبردار اور بربریت و خونخواری کے شائق مذہب کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ ان حالات میں مغرب میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے یہ بات بہت فکر انگیز اور قابل توجہ بن جاتی ہے کہ مغرب میں اسلام کے پیش کرنے کا انداز کیا ہونا چاہیے یا بالفاظ دیگر اسلام کے کن پہلوؤں کے اجاگر کرنے پر خصوصی توجہ دینا اسلام کی دعوت کی حکمت عملی کا تقاضا ہے۔ قرآن کے حکم کے مطابق ایسے حالات میں حکمت' موعظہ حسنہ اور احسن طریقہ پر ڈائیلاگ' باہمی افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنی ہوگی۔ ہمیں صبر و تحمل و اعتدال پسندی کے ساتھ اسلام کے پاکیزہ اخلاق و معاشرت کو عملی طور پر سامنے لانا ہوگا کیونکہ مغرب کے دانشوروں کا جو طبقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام سے الرجک ہے' اس کی پوری کوشش ہے کہ اسلام کو وحشت ناک و خونخوار مذہب بنا کر بار بار مغرب کے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا رہے۔ اس مقصد کی خاطر وہ اسلام کے لیے دہشت گرد اور فنڈا مینٹلسٹ (بنیاد پرست) جیسی اصطلاحات ایجاد کرکے اسے میڈیا کے ذریعہ عام کرتا ہے تاکہ اسلام کو سمجھنے کی اور افہام و تفہیم کی فضا نہ پیدا ہو سکے۔ اس طبقہ نے برسہا برس کی مسلسل جدوجہد سے اسلام اور انتہا پسندی و دہشت گردی کو ہم معنی لفظ بنادیا ہے حتیٰ کہ مغرب کے ایک عام آدمی کا ذہن اسلام کے لفظ سے دہشت گردی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اب ۱۹۹۷ء میں یہ طبقہ آہستہ آہستہ دہشت گرد کی جگہ نہایت ہوشیاری سے اسلامسٹ کا لفظ اختیار کر رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے عرصہ میں انتہا پسندی کی جگہ اسلامسٹ

13074

کی اصطلاح عام ہو جائے گی۔ یہ اصطلاح بادی النظر میں بے ضرر سی نظر آتی ہے مگر اس طبقہ کا مقصد اور خواہش یہ ہے کہ اسلام پر عمل پیرا ہونے کو دہشت گردی اور انتہا پسندی سمجھا جائے اور اسلام کے لفظ ہی سے مغرب کے عوام کا ذہن دہشت گردی کی طرف منتقل ہو جائے اس طرح ہر اس مسلمان کو جو نماز روزہ کا پابند ہو' مطعون کیا جا سکے اور اس کے خلاف مغرب کے عوام کو متنفر کیا جا سکے۔ ہمیں چاہیے کہ مغربی میڈیا کے اس قسم کے ہتھکنڈوں اور سازشوں پر نظر رکھیں۔